تدبّرِ قرآن

۲۹

العنکبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا آغاز ان لوگوں کو مخاطب کر کے ہوا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں ستائے جا رہے تھے۔ خاص کر نوجوان اور غلام، سورہ کے نزول کے دور میں، اپنے باپوں اور آقاؤں کے ہاتھوں بڑی سخت آزمائش کے دور سے گزر رہے تھے۔ قدرتی طور پر اس صورت حال نے کمزور ارادے کے لوگوں کے اندر بہت سے سوالات قرآن اور رسول کی صداقت سے متعلق پیدا کر دیے۔ جن کا بر موقع جواب دیا جانا ضروری ہوا تاکہ مظلوموں اور کمزوروں کی ہمت افزائی بھی ہو اور جو لوگ خدا کی ڈھیل کو اپنی فتح سمجھ کر ظلم و ستم میں بالکل بے باک ہوتے جا رہے تھے ان کو بھی تنبیہ ہو۔

حالات کے تقاضے سے اس میں ہجرت کی طرف بھی اشارات ہیں اور مظلوم مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ انھیں بہر حال ظلم کے آگے سپر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر حق کی خاطر انھیں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ جائے تو اس کے لیے بھی انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نہ خدا کی زمین تنگ ہے اور نہ اس کے خزانۂ رزق میں کمی ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں ہجرت کریں گے خدا ان کے لیے خود اپنا دامنِ رحمت پھیلانے گا اور ان کی ساری ضروریات کا کفیل ہو گا۔

پچھلی سورہ میں اہل کتاب کی مخالفت کی طرف بعض اشارات گزرے ہیں۔ اس سورہ میں ان کی مخالفت کھل کر سامنے آگئی ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی بھی دی گئی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں ان کو کیسا روش اختیار کرنی چاہیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۷) اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ حق کی راہ میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں۔ یہی پہلے بھی ہوا ہے اور یہی آئندہ بھی ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے۔ اسی سے مومن و منافق میں امتیاز ہوتا ہے۔ البتہ آج جن لوگوں کو اللہ نے ڈھیل دے رکھی ہے وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے اور جو لوگ ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں وہ یہ یقین رکھیں کہ آج ایمان کی راہ میں جو دکھ وہ جھیل رہے ہیں ان سے کہیں بڑھ کر وہ اس کا صلہ پانے والے ہیں۔

(۸ - ۱۳) والدین اور بزرگوں کی اطاعت کے حدود کی وضاحت کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کے تحت

ہے اس وجہ سے اگر کسی کے ماں باپ اس سے خدا کی نافرمانی کا مطالبہ کریں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ خدا کے ہاں کوئی دوسرے کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کی جواب دہی خود کرنی ہے۔

(۱۴-۴۰) حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور مدین، عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کے واقعات کی طرف اجمالی اشارہ جس سے مقصود انہی باتوں کو تاریخ کی روشنی میں مدلل کرنا ہے جو تمہید میں مذکور ہوئی ہیں۔ یعنی

— حق کی راہ میں امتحان کے مراحل سے گزرنا اللہ تعالیٰ کی ایک مقرر کردہ سنت ہے۔

— حق کے مقابل میں رشتوں، قرابتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔

— جو لوگ اللہ کے بندوں اور بندیوں کو فتنوں میں ڈالتے ہیں وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

(۴۱-۴۵) ان لوگوں کے زور و اثر کی تمثیل جو دوسرے سہاروں کے بل پر خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام سعی و تدبیر کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جس سے زیادہ کمزور اور بے بنیاد تعمیر کوئی بھی نہیں ہے۔ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ ایک غایت و حکمت کے ساتھ خدا نے اس کو بنایا ہے اور وہ غایت و حکمت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی کتاب سناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اسی نماز کے اندر اہل ایمان کے لیے تمام شرور و آفات سے امان اور یہی طاقت کا اصل خزانہ ہے۔

(۴۶-۵۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اہل کتاب کے بعض اعتراضات کا جواب۔ ان کے ساتھ بحث میں مسلمانوں کو جو روش اختیار کرنی چاہیے اس کی ہدایت۔ اچھے اہل کتاب کی تحسین۔ جو لوگ کسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے ان کو جواب۔

(۵۳-۵۵) عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت۔

(۵۶-۶۰) جو مسلمان ایمان لانے کے جرم میں کفار کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے ان کو ہجرت کی ہدایت اور دنیا و آخرت دونوں میں ان کو فوز و فلاح کی بشارت۔

(۶۱-۶۹) خاتمۂ سورہ جس میں خود مشرکین کے مسلمات سے ان پر توحید کے باب میں حجت تمام کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو ملامت کی گئی ہے کہ اس سرزمین میں تمھیں امن و رفاہیت تو خدا کے حرم کی بدولت حاصل ہوئی لیکن تم خدا کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہو اور عین خدا کے حرم میں بیٹھ کر اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے گن گا رہے ہو۔ ان کی اس ناشکری کا جو انجام ان کے سامنے آنے والا ہے اس کا بیان اور اہل حق کو خدا کی مدد و نصرت کی بشارت جو اس تاریک ماحول میں حق کا نور پھیلانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

سُورَةُ الْعَنكَبُوتِ (۲۹)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۶۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۳

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۴﴾ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ

فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰہِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۲ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْــَٔـلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳ ع ۱۳ ۱۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۳

یہ الٓمّٓ ہے۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے ؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیّز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیّز کر کے رہے گا۔ ۱ - ۳

کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے! بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! جو اللہ کی ملاقات کا متوقع ہے وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آ کے رہے گا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کر رہا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ اللہ عالم والوں سے بے نیاز ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اور اگر وہ تجھ

پر زور ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمہیں آگاہ کروں گا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔ ۸-۹

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں، جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں انھیں دکھ پہنچتا ہے تو وہ لوگوں کے پہنچائے ہوئے دکھ کو خدا کے عذاب کے مانند قرار دے بیٹھتے ہیں اور اگر تمھارے رب کی طرف سے کوئی مدد ظاہر ہوگی تو کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ تھے۔ کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے! اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۰-۱۱

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمھارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افتراء وہ کر رہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے۔ ۱۲-۱۳

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ اس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

'اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ الآیۃ' بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مکی پُرمحن زندگی سے گھبرا اٹھے تھے۔ بعض لوگ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ان کو اس راہ کی

راہِ حق میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں

صعوبتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کو گمان تھا کہ جب انھوں نے نیکی کی راہ میں قدم رکھا ہے تو راہ ہموار ملے گی اور وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کو جب کفار کے ہاتھوں زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے قدم ہل گئے اور اس طرح کے حالات میں خام ذہن کے لوگوں کو جس طرح کے شبہات لاحق ہوتے ہیں ان کے ذہنوں میں بھی اسی قسم کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ اللہ کا راستہ ہے تو یہ اتنا دشوار گزار کیوں ہے؟ اگر اس کی دعوت دینے والے اللہ کے رسول ہیں تو ان پر ایمان لانا اتنا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؟ ہم جب اللہ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں، پھر ہماری راہ میں یہ رکاوٹیں اور یہ اڑنگے کیوں ڈال دیے گئے ہیں! اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ راہِ حق اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے اور نہایت آسانی سے نفاق کے فتنہ میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ اس سورہ میں سب سے پہلے انہی لوگوں کی بیماری کی طرف توجہ فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا کہ اگر لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے اور مجرد ان کے اس دعوے کی بنا پر ان کا نام مومنین صادقین کے رجسٹر میں درج ہو جائے گا، ان کے کھرے کھوٹے ہونے کی کوئی جانچ نہیں ہوگی، تو یہ انھوں نے نہایت غلط سمجھا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (۳)

یہ اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤکد الفاظ میں اپنی اس سنت کی یاد دہانی فرمائی جس سے ان لوگوں کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے پہلے جو لوگ یہ دعویٰ لے کر اٹھے ہم نے ان کو بھی آزمائشوں میں ڈال کر ان کا امتحان کیا، اسی طرح ان کا بھی امتحان کریں گے۔ یہ اشارہ پچھلے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرف ہے۔ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ یعنی اگر یہ امتحان نہ ہو تو آخر یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے، کون جھوٹا ہے؟ اس وجہ سے اللہ لازماً راست بازوں اور جھوٹے مدعیوں میں امتیاز کرے گا۔ 'عَلِم' یہاں ممیز و معین کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے اور صیغہ یہاں وہ استعمال ہوا ہے جو تاکید کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مقررہ سنت ہے اس وجہ سے یہ کسی کو ناگوار ہو یا گوارا بہرحال اس امتحان سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ ہر ایک کے باطن سے اچھی طرح باخبر ہے کہ کون مخلص ہے اور کون منافق، لیکن وہ لوگوں کے ساتھ جزاو سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کو امتحان میں ڈال کر پرکھتا ہے اور اسی امتحان سے ہر ایک کے مدارج متعین ہوتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴)

ظالموں کو تنبیہ

ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو تنبیہ کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بھی تنبیہ فرما دیا جو کمزور مسلمانوں کو ظلم وستم کا ہدف بنائے ہوتے تھے۔ فرمایا اگر ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ اسی طرح ظلم وستم کرنے کے لیے چھوڑے رکھے جائیں گے اور کبھی ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے تو ان کا یہ گمان بالکل غلط ہے۔ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن اشارہ انہی ناہنجار لوگوں کی طرف ہے جو بے بس مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے اور خدا کی ڈھیل سے شہ پا کر دن پر دن دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا اسی طرح ان کو ڈھیل دیے رکھے گا تو وہ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔ یعنی ان کا یہ فیصلہ خدا کے بارے میں نہایت برا فیصلہ ہے۔ خدا کو اگر انھوں نے کمزور سمجھا ہے کہ وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت برا ہے اور اگر انھوں نے اپنی ان تمام ستم رانیوں پر اس کو راضی اور اس معاملے سے بالکل بے تعلق و بے پروا سمجھ رکھا ہے جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت غلط اور نہایت برا ہے۔

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ط وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۵)

مظلوم مسلمانوں کو تسلی

یہ مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ بہر حال تمھیں ہر کام آخرت کی امید پر کرنا ہے اور اگر تم یہ امید رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے اس کے لیے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے وہ لازماً پوری ہو کے رہے گی، ایک دن تم اپنے رب سے ملو گے اور اس دن تم اپنی ہر اس محنت و زحمت کا صلہ پا جاؤ گے جو اس کی خاطر تم نے جھیلی ہو گی۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ تمھاری سرفروشیاں بھی اس کے علم میں ہوں گی اور تمھارے دشمنوں کی ستم رانیاں بھی اس کے سامنے ہوں گی۔

وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۶)

ایک برسر موقع آگاہی

یہ تنبیہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان لاتا اور اس راہ میں مشقتیں اٹھاتا ہے وہ یاد رکھے کہ وہ اپنا ہی مستقبل سنوارتا اور اپنا ہی گھر بھرتا ہے، وہ خدا اور اس کے دین پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اسے اس بات سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کوئی مصیبت پیش آئی۔ اگر اسے کوئی مصیبت پیش آئی تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام عالم سے مستغنی ہے۔ البتہ لوگ اس کے محتاج ہیں اس وجہ سے خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی جو کوئی دیتا ہے وہ درحقیقت اپنے ہی نفع کے لیے دیتا ہے، اس سے خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح ملحوظ رہے کہ دنیا کی طرح دین بھی خدا کے کام آنے والی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ بندوں ہی کے کام آنے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ انسان ہی کی سعادت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں مشقت کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں کرتا اسی طرح انسان دین کی راہ میں چل کر اپنی ہی منزلیں طے کرتا ہے۔ خدا کی منزل نہیں طے کرتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷)

اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا معاملہ

قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'سَیِّاٰت' یہاں صغائر یعنی چھوٹے گناہوں کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ایمان و عمل کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا ہے کہ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ درگزر فرمائے گا اور اس نے جو نیک اعمال کیے ہوں گے ان کا وہ اُن سے کہیں بڑھ کر صلہ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کے ساتھ خدا کا معاملہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا صلہ پانے والا ہے تو پھر اس کے دل میں یہ وسوسہ کیوں پیدا ہو کہ اس نے خدا کی راہ میں کوئی تکلیف جھیلی تو یہ اس نے اللہ اور اس کے دین پر کوئی احسان کیا!

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸)

باپ ماں کے حقوق خدا کے حقوق کے تحت ہیں

اوپر کی آیات میں جس آزمائش کا ذکر ہوا ہے اس میں ایک بڑا حصہ اس آزمائش کا بھی تھا جو اسلام لانے والے نوجوانوں کو اپنے کا فرباپوں اور سرپرستوں کے ہاتھوں پیش آئی۔ باپ ماں کے حقوق چونکہ ہر دین میں مسلّم رہے ہیں اس وجہ سے اس حق سے باپوں نے بسا اوقات بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے حق کے نام پر انھوں نے اپنی اولاد کو خدا کے حقوق سے روکنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انھوں نے ظلم و ستم سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ اس کی مثالیں ہر دعوتِ حق کی تاریخ میں موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو کچھ ان کے باپ کے ہاتھوں گزری اس کی تفصیل اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے دور میں نوجوانوں کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان کی طرف بھی پچھلی سورتوں میں اشارے گزر چکے ہیں۔ یہی صورتِ حال ان نوجوانوں کو بھی پیش آئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ وہ بھی اسلام لانے کے جرم میں اپنے باپوں اور سرپرستوں کے ظلم و ستم کے ہدف بن گئے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہوا کہ اس باب میں نوجوانوں کو واضح ہدایت دے دی جائے کہ والدین اگر ان کے دین کے معاملے میں مداخلت کریں تو انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی اس کو فرمائی ہے کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو بے دلیل میرا شریک ٹھہرا تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کیجیو۔ 'توصیۃ' یہاں ہدایت دینے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن نے اس کو یہاں تمام مذاہب اور تمام انبیاء کی مسلّم تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات، انجیل اور زبور سب میں والدین کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ والدین کو جو حق اولاد پر ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے اس وجہ سے ان کو یہ

حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو خدا کے حقوق سے روکیں اور جب والدین کو یہ حق حاصل نہیں ہے، جن کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے تو پھر دوسروں کے لیے اس حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ اسلام میں قانون ہے کہ لَاطَاعَةَ لِمَخلُوقٍ فِی مَعصِیَةِ الخَالِقِ خالق کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں ۔

شرک ایک بے دلیل چیز ہے

'مَا لَیسَ لَکَ بِهٖ عِلمٌ' یہ شرک کی نفی کی دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ 'علم' کے معنی دلیل و برہان کے ہیں جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہر حال مانتا ہے۔ رہے دوسرے اس کے شریک تو ان کی دلیل پیش کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ان کو شریکِ خدا ٹھہراتے ہیں اور جب تک ان کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان کو خدائی میں شریک کر کے ان کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔

تنبیہ اور تسلی دونوں

'اِلَیَّ مَرجِعُکُم فَاُنَبِّئُکُم بِمَا کُنتُم تَعمَلُونَ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا نہیں ہے تو میں سب کو ان کے اعمال سے باخبر کروں گا۔ باخبر کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اعمال کی جزا اور سزا دینے کے ہیں۔ یعنی آج جو لوگ میرے بندوں کو میری راہ سے روکنے کے لیے ان پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں ان کی کرتوتیں بھی میں ان کے سامنے رکھوں گا اور میرے جو بندے میری راہ میں استقامت دکھائیں گے ان کی جانبازیوں کا انعام بھی ان کو بھرپور دوں گا۔

وَالَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدخِلَنَّهُم فِی الصّٰلِحِینَ (۹)

اوپر کی آیت میں نمایاں پہلو تنبیہ کا تھا اس آیت میں تسلی کے پہلو کا صریح الفاظ میں ذکر فرمادیا۔ 'اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے دشمنوں کی تمام دشمنی کے علی الرغم ایمان و عمل صالح پر قائم و استوار رہیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو ہم بلاشبہ زمرۂ صالحین میں داخل کریں گے۔ زمرۂ صالحین سے مراد اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں کا گروہ ہے جن کو اس دنیا کی مختلف آزمائشوں سے گزار کر اللہ تعالیٰ آخرت کی ابدی بادشاہی کے لیے منتخب فرما رہا ہے۔ اس گروہ میں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ بار پائیں گے جو اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کریں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن یَّقُولُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتنَةَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِن جَآءَ نَصرٌ مِّن رَّبِّکَ لَیَقُولُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُم اَوَلَیسَ اللّٰهُ بِاَعلَمَ بِمَا فِی صُدُورِ العٰلَمِینَ (۱۰)

ایمان کے مدعیوں کو تنبیہ

یہ ایمان کے مدعیوں کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس راہ کی آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا ہے تو وہ لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبرا اٹھے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے۔ حالانکہ اس دنیا میں جو دکھ بھی پہنچے گا بہرحال وہ چند روزہ ہے۔ برعکس اس کے خدا جس عذاب میں پکڑنے والا ہے وہ ابدی ہے۔ اس وجہ سے حق کی خاطر اس دنیا میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیل لینا بھی آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ اس سے مرعوب ہو کر آدمی اپنے آپ کو ابدی عذاب کا سزاوار بنالے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت جاری ہے اس کے تحت ہر شخص کو بہرحال دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ حق کا راستہ انتخاب کرے اور پھر پوری پامردی کے ساتھ خلق کی بے مہری بلکہ اس کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرے اور اگر اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تو پھر باطل کے ساتھ چلے اور آخرت میں ابدی خسران سے دوچار ہو۔ ان دو کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں آدمی کو جو دکھ پہنچے ہیں ان کو 'فتنہ' یعنی آزمائش سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ ان کی حیثیت بہرحال ایک آزمائش سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے گا اس کو عذاب سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ وہ درحقیقت عذاب ہوگا جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

'وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ'۔ یعنی اس وقت تو آزمائشوں نے ان کے قدم ہلا دیے ہیں اور یہ دشمنانِ حق کے ہم نوا بن بیٹھے ہیں لیکن کل جب خدا کی مدد و نصرت کے آثار ظاہر ہوں گے تو یہ بڑے دعوے کے ساتھ کہیں گے کہ ہم نے بھی اس حق کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں اس راہ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

'اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ'۔ فرمایا کہ یہ دعویٰ تو اس کے آگے کارگر ہو سکتا ہے جو دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو، جس پر سارا ظاہر و باطن آشکارا ہو اس پر یہ فریب کیا چلے گا!

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (۱۱)

مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح مخلصین کے ساتھ منافقین بھی ملے ہوئے ہیں تو اللہ ان کو اسی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ وہ ان دونوں کو چھانٹ کر الگ الگ کرے گا۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں مومنین مخلصین مراد ہیں۔ اس لیے کہ اس کے مقابل میں منافقین کا ذکر ہے جن کا کردار اوپر والی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بات بصیغۂ تاکید بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرق و امتیاز اللہ تعالیٰ کی صفات کا لازمی تقاضا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ بات اس کے عدل کے منافی ہوگی۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ ۭ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ ۭ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۝ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ ۡ وَلَیُسْـَٔلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (۱۲-۱۳)

بزرگوں کی غلط منطق

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' اگرچہ باعتبار لفظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کی اولاد یا دوسرے زیردست افراد اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے زیردستوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے ان پر جبر و ظلم بھی کرتے اور یہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالتے کہ ہم نیک و بد اور خیر و شر کو تم سے زیادہ سمجھنے اور پرکھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقے پر چلتے رہو، اگر ہمارا طریقہ غلط ہوا تو اس کا عذاب ثواب ہماری گردن پر ہے، تم اس کی ذمہ داری سے بری ہو، تمہارا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ یہ منطق بزرگوں، سرپرستوں، بالوں، استادوں، پیروں اور لیڈروں کی طرف سے، اپنے چھوٹوں کے مقابل میں، پہلے بھی ہمیشہ استعمال کی گئی ہے اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ ایک خاص حد تک اس کی تاثیر ایک امر فطری ہے اور اس میں چنداں ہرج بھی نہیں ہے۔ لیکن دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے۔ اس معاملے میں بے سوچے سمجھے نہ کسی کی تقلید جائز ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا جائز ہے۔ خدا کے ہاں کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یہاں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے بوجھ اٹھالیں گے وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں اور بالکل جھوٹ اطمینان دلا رہے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ یہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی ان کو حصہ بٹانا پڑے گا جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے۔

'عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ' سے مراد وہ بدعتیں ہیں جو ایجاد تو انھوں نے خود کیں لیکن ان کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور ان کی حمایت میں اتنا غلو ہے کہ دوسروں کو بھی ان پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے عذاب و ثواب کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ان سب کی بابت قیامت کے دن ان سے پرسش ہونی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۴۔۴۰

اوپر کی آیات میں تین باتیں مذکور ہوئی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اٹھتے ہیں وہ ٹھنڈی سڑک سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتے بلکہ ان کو اس راہ میں بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے، ان سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کے

ہاں کسی کو صادقین و مخلصین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری یہ کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص خود مسئول و ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا اس وجہ سے اس عذر پر تکیہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس نے کوئی بے راہروی دوسرے کے دباؤ سے اختیار کی، خواہ یہ دباؤ اخلاقی ہو یا مادی۔

تیسری یہ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حق پرست بندوں کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل تو ملتی ہے لیکن اس ڈھیل سے اگر ان کا طغیان بڑھ جاتا ہے تو وہ لازماً اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور جب اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہتا۔

آگے کی آیات میں انہی حقائق کو حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین و مکذبین کے احوال و واقعات سے مبرہن کیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۗ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ

ع ۲ ۹ ۱۴

وقف لازم

ع ۳ / ۸ / ۱۵

رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ
بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا
كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ
فِيْهَا ٘ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾
وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ٝ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ
بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ
مَّسٰكِنِهِمْ ٝ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ٝ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا
سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ
حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا
بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

كَانُوٓا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ آیات ۱۴-۴۰

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ تو ان کو طوفان نے آپکڑا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے بنے۔ پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا۔ ۱۴-۱۵

اور ابراہیم کو بھی رسول بنا کر بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر جانو۔ تم اللہ کے سوا بس بتوں کی پوجا کر رہے ہو اور بہتان گھڑ رہے ہو جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمھارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار رہو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۶-۱۷

اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کر دیتا ہے۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ ان سے کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کس طرح اللہ نے خلق کا آغاز کیا اور پھر اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور نہ تم زمین میں خدا کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمان میں اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ اور جن لوگوں

نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو وہی لوگ ہیں جو میری رحمت سے محروم ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۱۹-۲۳

تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ انھوں نے کہا کہ اس کو قتل کردو یا جلادو۔ تو اللہ نے اس کو آگ سے نجات دی۔ بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۲۴

اور اس نے کہا تم نے اللہ کے سوا جو بُت بنائے ہیں، تمھاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵

پس لوط نے اس کی تصدیق کی اور کہا، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک وہی عزیز و حکیم ہے۔ ۲۶

اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور اس کی ذرّیت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ہم نے اس کا صلہ اس کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷

اور لوط کو بھی ہم نے رسول بنایا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا! کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ وہ بولے کہ اگر تم

سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ! ۲۸-۲۹

اس نے دعا کی، اے رب! اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد کر۔ اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے کہا، ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس کے باشندے بڑے ہی نابنجار ہیں! اس نے کہا، اس میں تو لوط بھی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ جو اس میں ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اس کو اور اس کے متعلقین کو بچا لیں گے مگر اس کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ۳۰-۳۲

اور جب یوں ہوا کہ آئے ہمارے فرستادے لُوط کے پاس تو وہ ان سے آزردہ اور دل تنگ ہوا اور وہ بولے کہ تم نہ کوئی اندیشہ کرو، نہ غم، ہم تم کو اور تمھارے متعلقین کو بچا لیں گے بجز تمھاری بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ہم اس بستی والوں پر، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں، آسمان سے ایک آفت اتارنے والے ہیں! اور ہم نے اس کی ایک واضح نشانی باقی رکھی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۳-۳۵

اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو اس نے دعوت دی، اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور یوم آخرت کے منتظر رہو اور زمین میں فساد مچانے والے بن کر نہ بڑھو۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۳۶-۳۷

اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور تم پر ان کی بستیوں کے نشان واضح ہیں۔ اور شیطان نے ان کے مشاغل ان کی نگاہوں میں کُھبا دیے اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے روک دیا، حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸

اور قارون و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔ ۳۹

پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۴)

حضرت نوحؑ کا طویل امتحان

حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال عمر کا ذکر صرف اسی سورہ میں آیا ہے۔ عمر کی یہ تصریح اس سورہ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جلدی سے، بغیر کوئی زحمت و مشقت جھیلے، منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے بلکہ انھیں ایک طویل مدت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انھیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سُرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔

حضرت نوحؑ کے زمانہ میں عمروں کا اوسط

حضرت نوح علیہ السلام کی جو عمر یہاں مذکور ہوئی ہے بالکل تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ تورات میں ہے:

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی، تب اس نے وفات پائی۔" (پیدائش: ۹-۲۸-۲۹)

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوحؑ کے والد کی عمر سات سو ستہتر برس کی ہوئی۔ ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس مذکور ہے۔ اسی طرح ان کے

کے آباء اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ برس مذکور ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے برس۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ کی یہ عمر اس دور کی اوسط عمر کے بالکل مطابق ہے۔ اس عہد کی کوئی مدوّن تاریخ موجود نہیں ہے۔ صرف تورات ہی کے ذریعہ سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ تورات کے ان بیانات کی تکذیب کی جائے ــــ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس عہد میں جب کہ ہماری یہ زمین الٰہی آباد ہو رہی تھی اور تمدن و معیشت کے وہ مفاسد ظہور میں نہیں آئے تھے جو اب زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئے ہیں، اگر عمروں کا اوسط زیادہ رہا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ عین حکمتِ الٰہی اور فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ اس ٹکڑے سے تمہید میں بیان کردہ دوسری حقیقت کی تائید ہوئی کہ ہر چند اللہ تعالیٰ اعدائے حق کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ ان کو ضرور پکڑتا ہے اور یہ پکڑنا ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنتے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق جس طرح اہلِ حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے اسی طرح اہلِ باطل پر عذاب سے پہلے ان پر اتمامِ حجت لازمی ہے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۱۵)

امتحان کے بعد حضرت نوحؑ اور ان (کے ساتھیوں کی نجات)

یعنی اتنی طویل کشمکش اور آزمائش کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا جس کے آئینہ میں اہلِ حق اور اہلِ باطل دونوں اپنے اپنے انجام دیکھ سکتے ہیں۔

ضمیر کا مرجع پورا واقعہ ہے

وَجَعَلْنٰهَا، میں ضمیر کا مرجع کوئی معین لفظ نہیں ہے بلکہ وہ پورا واقعہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔ عربی میں ضمیروں کے استعمال کا یہ طریقہ معروف ہے، اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت نوحؑ کے اس واقعہ میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی طرف سے کوئی دوسرا جواب دہی نہ کر سکے گا۔ اگر اس کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو خدا کی پکڑ سے ضرور بچا لیتے لیکن جب حضرت نوحؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے بیٹے کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

وَاِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کا امتحان

یعنی جس طرح ہم نے نوحؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح ابراہیمؑ کو بھی اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے غضب سے ڈرو۔ اس کے غضب

سے ڈرو، یعنی اس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کرکے اس کے غضب کو دعوت نہ دو۔ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی یہ بہترین نصیحت اور بہترین موعظت ہے جو میں بالکل وقت پر تمھیں پہنچا رہا ہوں بشرطیکہ تم اس کو سمجھو اور اس کی قدر کرو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ط اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ط اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷)

یعنی اپنے جن معبودوں کو تم شریکِ خدا سمجھ کر پوج رہے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض بت اور تھان اور استھان ہیں۔ وَتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا یعنی تمھارا یہ دعویٰ کہ خدا نے ان کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے محض ایک بہتان ہے جو تم خدا پر لگا رہے ہو۔ نہ خدا نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور نہ تمھارے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ، یعنی اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ رزق و فضل پر تمھارے ان دیوتاؤں کا کوئی اختیار ہے تو یہ محض تمھارا وہم ہے ان کو تمھارے رزق پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز خدا ہی کے اختیار میں ہے تو اگر تم رزق و فضل کے طالب ہو تو خدا ہی کی طرف رجوع کرو اور اسی سے مانگو۔

وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ یعنی تمھاری عبادت و شکر گزاری کا اصل حقدار وہی ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور جو تمھیں سب کچھ دیتا ہے تو اس کے حق میں دوسروں کو شریک کرکے اس کی ناشکری نہ کرو۔

وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ یعنی مرنے کے بعد تم اٹھائے جاؤ گے اور تمھاری پیشی اسی کے سامنے ہونے والی ہے۔ اس دن تمھارے یہ اصنام و اوثان تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

وَاِنْ تُکَذِّبُوْا فَقَدْ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ط وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۱۸)

یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور میری تکذیب پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو جو انجام ان کا ہوا اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو!

وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ یعنی رسول کے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ہوتی ہے۔ وہ فرض میں نے ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اب جو پرسش ہوگی وہ تم سے ہوگی۔ اب مجھ سے یہ پرسش نہیں ہوگی، کہ تم نے ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی!

اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۱۹)

چند آیات بطور تضمین

یہ اور اس کے بعد کی آیات، آیت ۲۳ تک، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات جب قیامت کے ذکر تک پہنچی تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے قیامت کے دلائل کا حوالہ دے کر حضرت ابراہیمؑ کی بات کو مکمل اور کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ۔ یعنی اگر انھیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی شک ہے تو کیا انھوں نے اس کائنات میں اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کو فنا کرتا ہے اور پھر دوبارہ ان کا اعادہ کر دیتا ہے۔ یہ اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو مختلف اسلوبوں سے، متعدد مقامات میں پیچھے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زمین کو بالکل خشک و بے آب و گیاہ کر دینے کے بعد اس کو ازسرنو سرسبز و شاداب کر دینے میں خدا کو کوئی مشکل نہیں پیش آرہی تو لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر دینے میں اس کو کیوں مشکل پیش آئے گی۔

إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ یعنی اس کو مستبعد اور بعید از امکان نہ خیال کرو۔ جس خدا نے ہر چیز کو عدم سے وجود بخشا اور جو برابر اپنی اس قدرت کا اس کائنات میں مشاہدہ کرا رہا ہے اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا نہایت سہل ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۰)

دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت

یہ اس دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ یہ تمام حقائق کی تعلیم کے لیے خود اپنے وجود کے اندر ایک مکمل تربیت گاہ ہے۔ توحید، قیامت اور جزا و سزا کے لیے باہر سے دلیل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے شب و روز کے مشاہدات میں ان میں سے ہر چیز کی شہادت موجود ہے۔ فرمایا کہ اس زمین میں چلو پھرو اور غور کی نگاہ سے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کا آغاز فرماتا ہے اور پھر اس کو فنا کر کے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ ایک قوم کو وہ وجود بخشتا ہے اور پھر اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ رات کے بعد دن نمودار کرتا ہے، خزاں کے بعد بہار آجاتی ہے۔ یہ سارے مشاہدات وہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان نہ تصور کرے بلکہ اپنے روز مرہ کے مشاہدات کی روشنی میں یقین رکھے کہ جس خالق کی قدرت کے یہ کرشمے وہ ہر روز اور ہر آن مشاہدہ کر رہا ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَن يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ (۲۱)

یعنی اس دنیا کے واقعات و حوادث اور اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔ اس کے اپنے قانونِ عدل و حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی اس کی مشیت و قدرت پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آخرت میں بھی عذاب و ثواب کا معاملہ تمام تر اسی کے اختیار میں ہوگا، کوئی دوسرا اس کے اس اختیار میں مداخلت نہ کر سکے گا۔ وہی اپنے عدل و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

'وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ' اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ سب کی واپسی بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے، کسی اور کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ مولیٰ و مرجع بن سکے۔ جب اس دنیا میں اس کی گرفت سے بچانے والا کوئی اور نہ بن سکا، کسی اور کی ڈوہائی کچھ کارگر نہ ہو سکی تو آخرت میں اس کے نافع ہونے کی توقع کس بنیاد پر کی جائے!

وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۲۲)

اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ارشاد ہوئی ہیں۔ اب یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی جا رہی ہے تاکہ کلام بالکل مطابقِ حال ہو جائے۔ فرمایا کہ جب وہ تم کو پکڑنا چاہے گا تو اس کی پکڑ سے نہ تم زمین میں کہیں اس کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمانوں میں۔ نہ یہاں تمہارا کوئی ساتھی اور کارساز بن سکے گا نہ آخرت میں تمہارا کوئی حامی و شفیع ہوگا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِن رَّحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۳)

'یَئِسُوا' یہاں 'حرموا' اور 'تعسوا' کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت و عنایت سے محروم ہوئے۔ اس لفظ میں 'حرموا' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ بعض اوقات کسی چیز سے محرومی اس کے دوبارہ حصول کی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ محرومی زیادہ دل شکن نہیں ہوتی۔ کفار کو آخرت میں خدا کی رحمت سے جو محرومی ہوگی وہ کامل مایوسی کے ساتھ ہوگی۔ ان کے لیے امید کے دروازے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا، جو آج ان کو سنائی جا رہی ہیں اور خدا کے حضور پیشی کا، جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے، انکار کیا وہ یاد رکھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری رحمت سے مایوس و نامراد ہوئے۔ اس رحمت کا استحقاق پیدا کرنے کا موقع صرف اسی دنیا کی زندگی میں ہے۔ جو لوگ یہ فرصت

رائگاں کر دیں گے ان کے لیے اس کو کھو کر پا سکنے کا کوئی امکان نہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۴)

اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ

بیچ میں تضمین کی جو آیات آ گئی تھیں وہ اوپر کی آیت پر ختم ہوئیں۔ اب اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ پھر سامنے آ گیا۔ فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دردمندانہ دعوت کا جواب ان کی قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اس شخص کو یا تو قتل کر دو یا جلا دو۔ بالآخر اسی دوسری رائے پر اتفاق ہوا اور قرآن میں دوسری جگہ یہ تصریح ہے کہ اس کے لیے ایک خفیہ اسکیم بنائی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دشمنوں کے اس شر سے بچا لیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کے اندر ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان کی راہ اختیار کریں۔

اس سرگزشت کی نشانیاں

اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ جو لوگ ایمان کی راہ اختیار کریں وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اس راہ میں بہت سے سخت امتحانات پیش آتے ہیں، جن سے گزرے بغیر کوئی شخص ایمان کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اس راہ میں آگ کے الاؤ کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس راہ میں علائق کی زنجیریں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ ــــ آزر ــــ نے ان پر پورا دباؤ ڈالا کہ ان کو ایمان کی راہ سے روک دے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دین کے معاملہ میں ان کا باپ خدا کے ہاں ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہوگا بلکہ انھیں اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی اس وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ اپنے باپ کے لیے اپنے سینہ میں ایک نہایت دردمند دل رکھتے تھے لیکن وہ اس کے مقابل میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے علائقِ محبت کی تمام زنجیریں توڑ کر سینہ سپر ہو گئے۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ جو لوگ حق کو لپیٹ کرنے کے لیے اپنا زور و زر اور اپنا اختیار و اقتدار استعمال کرتے ہیں، اگرچہ ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو زور آزمائی کی مہلت ملتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کا یہ ایک لازمی تقاضا ہے لیکن اس مہلت کی ایک خاص حد ہے۔ اگر اہلِ حق اس کے مقابل میں ڈٹ جاتے ہیں تو بالآخر فتحمند وہی ہوتے ہیں اور اہل باطل دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۵)

گمراہ لیڈروں اور گمراہ پیروؤں کی دوستی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے

اِنَّمَا حصر کے مفہوم میں ہے اور مَوَدَّةَ بَیْنِكُمْ بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ حال کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم نے اللہ کے سوا دوسرے اصنام واوثان بنائے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض تمھارے خیال و وہم کی ایجاد ہیں۔ ان کے ساتھ تمھاری ساری دوستی و نیاز مندی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ تم کہو گے کہ اے رب، ہم کو فلاں اور فلاں نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ ورغلاتے تو ہم تیری سیدھی راہ پر ہوتے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ہم نے تم کو ویسے ہی بنایا۔ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی تو ہم کو ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے کو ملامت کرو اور اپنے کیے کی سزا بھگتو۔ اس جنگ و جدال کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے اور مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں، قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کر لیں گے، ان کو یہ آگاہی دے دی جائے کہ اس دن اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیرو، اس قسم کے معبود اور اس قسم کے عابد سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے بس اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۶)

اول اول صرف حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کا ساتھ دیا

اٰمَنَ لَهٗ تصدیق و تائید کے مفہوم میں ہے۔ حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیم کے بھتیجے اور خود منصب رسالت پر فائز اور اپنی قوم کی دعوت پر مامور تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے جو روش اختیار کی اس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی تصدیق و تائید کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی پر بھی ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ ان کی دعوت میں ان کی ہمنوائی کرنے والا حضرت لوطؑ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا لیکن بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی دعوت کی صدائے بازگشت دنیا کے کونے کونے سے اٹھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ قَالَ کا فاعل حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کا رویہ دیکھ لیا کہ وہ ان کے قتل کر دینے اور جلا دینے کے درپے ہے تو انھوں نے سنتِ الٰہی کے مطابق، ہجرت کا عزم فرمایا کہ اب میں قوم کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میرا رب عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر، حالات بالکل ناسازگار ہیں لیکن میرا رب ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ وہ میرے لیے اپنی قدرت و حکمت سے راہ کھولے گا اور اس تاریکی کے اندر سے روشنی نمودار کرے گا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷)

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

یہ وہ انعام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہجرت کے بعد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اگرچہ ابراہیمؑ نے جب ہجرت کی ہے لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی ان کی ہمنوائی کرنے والا نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ وہ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں صالحین و ابرار کی معیّت و رفاقت نصیب کرتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے بیٹے اور پوتے عطا فرمائے جن سے دین کے خدمت گزاروں کا ایک عظیم گھرانا آباد ہوا اور اس گھرانے کے اندر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی ان کی خدمات کا صلہ عطا ہوا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے۔

نبی صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت

اس آیت میں در پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں پر کفار نے عرصۂ حیات بالکل تنگ کر دیا تھا اور مظلوم مسلمانوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے اس پہلو کو نمایاں کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ اگر یہ مرحلہ پیش آتا ہے تو اس سے ہراساں نہ ہونا، اپنے باپ ابراہیمؑ کی طرح اپنے ربِّ عزیز و حکیم کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا۔ اگر اپنے رب کی خاطر تم اپنی ناہنجار قوم کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے ساتھی پیدا کرے گا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

حضرت لوطؑ، اوپر گزر چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، ان کی دعوت کا علاقہ اگرچہ الگ تھا لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کی قوم میں یوں تو وہ ساری ہی برائیاں تھیں جو دوسری مشرک قوموں میں رہی ہیں لیکن امرد پرستی کی بے حیائی اس قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر گئی تھی اس وجہ سے اس کی اصلاح پر ان کو خاص طور پر توجہ مرکوز کرنی پڑی۔ لفظ 'فَاحِشَة' سے انھوں نے اسی بے حیائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ 'فَاحِشَة' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بدکاری و بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ 'لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ' کے الفاظ سے حضرت لوطؑ نے لوگوں کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ان کو غیرت دلائی کہ یہ تو وہ بے حیائی ہے جو سب سے پہلے اس روئے زمین پر تمھی نے ایک فیشن کی حیثیت سے اختیار کی ہے، تم سے پہلے کسی قوم نے بھی یہ لعنت ایک قومی تہذیب کی حیثیت سے اختیار نہیں کی۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ 'مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ قوم لوط سے پہلے دنیا میں کسی ایک فرد نے بھی اس برائی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ لفظ 'اَحَدٌ' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ تم سے پہلے کسی قوم نے بھی اس بے حیائی کو من حیث القوم اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اس برائی کا یہی وہ پہلو ہے جس کے سبب سے پوری قوم لوط عذاب کی مستحق ٹھہری۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹)

برائی فیشن کی حیثیت سے

'سبیل' سے مراد یہاں فطرت کی راہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نہایت دردمندانہ لہجہ میں فطرت سے اس انحراف پر ملامت فرمائی کہ بدبختو، تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی قوم میں یہ بیماری عام ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت بالکل ہی ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ رہے گی بھی تو وہ بھی صحیح نوعیت کی نہ ہو گی اور اس طرح پوری قوم ہلاکِ نسل کی اس راہ پر چل پڑے گی جو فاطرِ فطرت کے منشا کے بالکل خلاف اور تباہی کی راہ ہے۔

'وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ' سے اس فسادِ اخلاق کے عام ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی برائی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ان کی سوسائٹی میں اس نے تہذیب اور فیشن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مجلسوں میں علانیہ ناشائستہ حرکتیں ہوتیں اور فخر و لذت کے ساتھ ہر بزم و انجمن میں ان کے چرچے ہوتے۔ ہماری جس شاعری کو حالی مرحوم نے سنڈاس سے بدتر قرار دیا ہے وہ انہی خرافات کا دفتر ہے اور ہمارے قومی اخلاق و کردار پر اس کا جو اثر پڑا اس کے دردانگیز نتائج کی تفصیل تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ الآیۃ' یعنی ان تمام دردمندانہ تنبیہات کا جواب اس قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اگر تم سچ مچ اللہ کے رسول ہو اور تمہاری تکذیب سے ہم پر اللہ کا کوئی عذاب آنے والا ہے تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ تم اس عذاب کو دکھا دو تب ہم تمہاری بات باور کریں گے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۳۰)

حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہِ الٰہی میں

جب قوم نے اپنی ضد سے حضرت لوطؑ کو بالکل مایوس کر دیا تب انھوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے رب، میری تمام سعیِ اصلاح بے سود ہو چکی ہے تو اب اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد فرما۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۳۱)

رحمت و نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں

"بُشْریٰ" سے مراد وہ بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی۔ اس کا ذکر اوپر آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت کے ساتھ قوم لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی بھی خبر دی کہ اب ہم اس بستی والوں کو (اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے) ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہی ہاتھ میں رحمت و نقمت دونوں ہیں۔ جس طرح ایک ہی بارش کو وہ کسی کے لیے عذاب اور کسی کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اسی طرح اس کے جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت لے کر آئے وہی قوم لوط کے لیے عذاب کا پیش خیمہ بن کر نمودار ہوئے۔ اس سے مشرک قوموں کے اس واہمہ کی بھی تردید ہو رہی ہے جس میں وہ اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کے سبب سے مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خیر و شر کے الگ الگ دیوتا مان کر ان کی الگ الگ عبادت شروع کر دی۔

"اِنَّ اَھْلَھَا کَانُوْا ظٰلِمِیْنَ" یہ قوم لوط کی ہلاکت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ خود ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہوا جو انھوں نے اپنے اوپر کیا کہ فطرت کی راہ سے کھلم کھلا انحراف اختیار کیا اور اللہ کے رسول نے جب اس کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو اس کی بات پر کان دھرنے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ اس طرح کے لوگوں پر جو عذاب آتا ہے وہ خود ان کے ظلم کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا ڭ لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۳۲)

حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے باب میں حضرت ابراہیمؑ کی تشویش کا ازالہ

حضرت ابراہیمؑ کو جونہی فرشتوں کی اس مہم کا علم ہوا انھیں حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کی فکر پڑ گئی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟ انھوں نے سوال فرمایا کہ اس بستی میں تو لوطؑ بھی ہیں؟ فرشتوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ اس میں جتنے اہل ایمان ہیں ہم ان سب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں، ہم لوطؑ اور ان کے تمام متعلقین کو اس عذاب سے بچا لیں گے، صرف ان کی بیوی پیچھے رہ جائے گی اور وہ عذاب کی زد میں آئے گی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۳۳)

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے جس کی طرف علامہ ابن قیم نے اشارہ فرمایا ہے کہ جب "لَمَّا" اور اس کے بعد کے فعل کے درمیان "اَنْ" آ جائے تو اس صورت میں شرط اور اس کے جواب کے درمیان سبب اور مسبب کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت لوطؑ کی آزردگی کا سبب

مطلب یہ ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے ہو کر حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر آزردہ اور متردد ہوئے۔ یہاں یہ سوال قابل غور ہے کہ حضرت لوطؑ فرشتوں کو دیکھ کر آزردہ و دل گرفتہ کیوں ہوئے؟ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کا خیر مقدم کیوں نہیں کیا؟ قرآن مجید کے دوسرے مقامات کے مطالعہ سے ان کی اس آزردگی و پریشانی کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، جو الگ الگ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

پہلے مرحلے میں تو وہ ان کو دیکھ کر اس وجہ سے پریشان ہوئے کہ یہ فرشتے خوبرو نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے۔ ان کا اس شکل و صورت میں آنا قوم لوط کے لیے ایک آخری ابتلار تھا تاکہ ان کے اندر جو خبث بھرا ہوا ہے وہ پوری طرح ظاہر ہو جائے اور جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کے وہ آخری درجے میں مستحق بن جائیں۔ حضرت لوطؑ پر یہ حقیقت چونکہ ابھی واضح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ اپنے دروازے پر چند خوبرو شریف زادوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ آج کا دن تو بہت کٹھن ہے۔ بستی کے گنڈوں کو جب ان نوجوانوں کی خبر ہوگی تو وہ ٹوٹ پڑیں گے اور مجھ کو اور میرے مہمانوں کو رسوا کریں گے۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ گنڈے ان نوجوانوں کی خبر پاتے ہی حضرت لوطؑ کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو رسوا کرنا چاہا۔ حضرت لوطؑ نے لاکھ منت سماجت کی لیکن انھوں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ بالآخر فرشتوں نے اپنا پردہ اٹھایا اور حضرت لوطؑ کو اطمینان دلایا کہ تم اطمینان رکھو، ہم چھوکرے نہیں ہیں، جیسا کہ ان اندھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ ہم خدا کے فرشتے ہیں اور ان کے لیے فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں۔ فرشتوں کے اس انکشاف راز سے حضرت لوطؑ کو یہ تو اطمینان ہوا کہ گنڈوں کے شر سے وہ اور ان کے مہمان محفوظ ہیں لیکن عذاب کی خبر بھی ان کے لیے سخت تردد کا باعث ہوئی کہ اب دیکھیے ان کے اور ان کے متعلقین کے لیے کیا حکم ہوتا ہے! فرشتوں نے اس پہلو سے بھی ان کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے اور اپنے متعلقین کے باب میں کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اس آفت سے نجات دیں گے۔ البتہ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ یہاں سے نہیں نکلے گی۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہوگی۔

حضرت لوطؑ کی بیوی کے ذکر کی خاص وجہ

یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی کے انجام کی طرف دو مرتبہ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملہ میں کوئی کسی دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن چونکہ وہ خود ناہنجار تھی اس وجہ سے وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئی اور حضرت لوطؑ سے جو نسبت اس کو حاصل تھی وہ اس کے لیے کچھ نافع نہ بن سکی۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۳۴)

قوم لوطؑ پر قہر آسمانی

حضرت لوطؑ کو نجات کی خوش خبری دینے کے بعد فرشتوں نے ان کو اس فیصلۂ الٰہی سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس بستی والوں پر ہم قہر آسمانی نازل کرنے والے ہیں۔ 'رجز' سے مراد اس طرح کا عذاب ہے جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے۔ اس کے ساتھ مِّنَ السَّمَآءِ کی قید اس کی شدت اور بے پناہی کے اظہار کے لیے ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں قہر الٰہی یا عذاب آسمانی کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی زبان میں یہ اسلوب ہے۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ' سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کا عذاب کسی قوم پر اس وقت بھیجتا ہے جب سرکشی و نافرمانی اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۵)

خاموش آثار سے صرف اہل عقل فائدہ اٹھاتے ہیں

قوم لوطؑ کی یہ بستی قریش کی تجارتی گزرگاہ پر واقع تھی اس وجہ سے وہ ان کے لیے اس سنت الٰہی کے ظہور کا ایک نہایت واضح نشان تھی جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا لیکن یہ خاموش آثار نافع ان کے لیے ہوتے ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ آخر اس زمانے میں کتنے ماہرین اثریات ہیں جو قدیم کھنڈروں کے ایک ایک نقش کو پڑھ لینے میں بڑے ہوشیار ہیں لیکن ان سے جو اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں ان کے سمجھنے میں ان کی عقل بالکل کند ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۚ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۳۶-۳۷)

بعض اقوام و افراد کی طرف اجمالی اشارات

اوپر کی سرگزشتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن آگے صرف اجمالی حوالے پر اکتفا فرمایا ہے۔ مقصود ان کے حوالہ سے اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کرنا ہے جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴) (کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے؟ اگر انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے تو بہت ہی برا فیصلہ کر رہے ہیں) آگے کے تاریخی واقعات اسی بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شرارت کرنے والوں کو جو ڈھیل دیتا ہے اس سے ان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اب ان کی پکڑ نہیں ہوگی یا وہ خدا کے قابو سے باہر ہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام میں سے قوم شعیب اور عاد و ثمود کا حوالہ دیا ہے اور جبار و سرکش افراد میں سے قارون، فرعون اور ہامان کا اور قریش کو متنبہ کیا ہے کہ جو زور و اقتدار آج تم کو اور تمہارے لیڈروں کو حاصل ہے اس سے زیادہ زور و اقتدار ماضی میں ان کو حاصل رہ چکا ہے لیکن جب انھوں نے سرکشی کی اور ہماری تنبیہات کے باوجود باز نہیں آئے تو ہم نے ان کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ ان کا سارا زور و زر ہمارے مقابل میں ذرا بھی ان کے کام نہ آسکا۔

قوم شعیب اور قریش میں قدر مشترک

قوم شعیب کے متعلق پیچھے واضح ہو چکا ہے کہ اس قوم نے تجارت کے میدان میں بڑی ترقی کی تھی۔ یہی اصل میدان قریش کا بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ بھی تجارت پیشہ تھے لیکن ابھی یہ ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے۔ شاید اسی اشتراک کی وجہ سے انہی کے حالات اور انجام کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ اہل مدین کے حالات سے سبق لو جن کی طرف ہم نے شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے ان کو خدا کی بندگی کی دعوت دی اور آخرت کا خوف دلا کر متنبہ کیا کہ دنیا میں بڑھو اور پھیلو تو مفسد بن کر نہ پھیلو بلکہ مصلح اور حق و عدل کے علم بردار بن کر پھیلو لیکن انھوں نے حضرت شعیبؑ کی ایک بات بھی نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عین ان کے دورِ عروج میں ان کو پکڑا اور ایسا عذاب ان پر آیا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ سورۂ ہود کی آیت ۸۵ کے تحت ان کے فساد فی الارض اور آیت ۹۴ کے تحت ان کے عذاب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَاْ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ تف وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۳۸)

عاد اور ثمود

یہاں فعل 'اَخَذْنَا' بربنائے قرینہ محذوف ہے یعنی ہم نے عاد و ثمود کو بھی اس سے پہلے عذاب میں پکڑا۔ ان قوموں کی تمدنی و تعمیری ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ 'وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ' یہ قریش کو توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم لوط کی طرح ان کی بستیوں کے آثار بھی تم سے مخفی نہیں ہیں، تم اپنے تجارتی سفروں میں ان کے کھنڈروں پر سے گزرتے ہو اور اندازہ کر سکتے ہو کہ ماضی میں وہ کس شان و شوکت کے مالک تھے لیکن اب ان کے کھنڈروں کے سوا ان کی کہانی سنانے والا روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہا۔ 'وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ' یعنی یوں تو وہ بڑے کاردان، بڑے زیرک و ہوشیار، تعمیر و تمدن اور حکومت و سیاست میں بڑے ماہر و چالاک تھے لیکن ان کی یہ چالاکی و ہوشیاری ان کو شیطان کے پھندوں سے نہ بچا سکی۔ اس نے ان کے دنیوی انہماک کو اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا کہ ان کی آنکھیں خدا اور آخرت کی طرف سے بالکل بند ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اصل شاہراہ سے وہ بالکل منحرف ہو گئے اور ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے ——— اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مجرد سائنس اور تمدن و تعمیر میں کسی قوم کا عروج اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ وہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہے، جیسا کہ عام طور پر بے بصیرت لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی ایک آنکھ کھلی ہوئی ہے جو اس دنیا کو دیکھتی ہے لیکن دوسری آنکھ جو اس دنیا کی پس پردہ حقیقتوں کو دیکھتی ہے اگر وہ کھلی ہوئی نہ ہو تو تمام علم و سائنس کے باوجود شیطان اس کو ہلاکت کے ایسے کھڈ میں گراتا ہے جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ تف وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ

وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ (۳۹)

تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین

یہ نام بھی اسی فعل محذوف کے تحت ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ گزرا۔ اقوام کے ذکر کے بعد یہ تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین — قارون، فرعون اور ہامان — کا ذکر فرمایا ہے۔ ان تینوں کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ سورۂ قصص میں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم میں جو حیثیت قارون کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں اسی سے ملتی جلتی حیثیت ابولہب کی تھی۔ اس وجہ سے یہ محض ماضی کے اشخاص کا حوالہ نہیں ہے بلکہ قریش کے سامنے یہ ایک آئینہ رکھا گیا ہے جس میں ان کے لیڈر اپنی اپنی شکلیں بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو بھی موسیٰؑ نے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں لیکن ان کی آنکھوں پر غرور کی ایسی ایسی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں کہ کوئی نشانی بھی ان کو کھولنے میں کارگر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا۔ 'وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو آیت ۴ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی جب وہ ہمارے عذاب کی گرفت میں آ گئے تو اپنے تمام طمطراق، اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور اپنی ساری دولت و حشمت کے باوجود ہماری گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۴۰)

خلاصۂ کلام

اب یہ آخر میں بطور خلاصہ مذکورہ بالا تمام اقوام و افراد کا انجام یکجا بیان فرما دیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی پاداش میں پکڑا۔ کسی پر ہم نے حاصب (کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا) بھیجی، کسی پر رعد و برق کا عذاب بھیجا، کسی کو زمین سمیت دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

پچھلی سورتوں میں ان تمام عذابوں کی تفصیل گزر چکی ہے۔

— قوم لوط پر حاصب کا عذاب آیا۔

— عاد، ثمود، مدین پر صیحہ کا عذاب نازل ہوا۔

— قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

— فرعون اور ہامان غرق کر دیے گئے۔

'وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ' یعنی یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن انھوں نے اللہ کے رسولوں کی کوئی پروا نہ کی۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۱۔ ۶۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں بالترتیب مندرجہ ذیل باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔

مشرکین نے شرک کی اساس پر جو گھروندا بنایا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کی حیثیت مکڑی کے جالے کی ہے۔ اگر اس کے بل پر انھوں نے حق کا مقابلہ کرنا چاہا ہے تو انھوں نے نہایت کمزور سہارا ڈھونڈا ہے۔ یہ سہارا نہ دنیا میں ان کے کام آنے والا بنے گا نہ آخرت میں۔

اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عدل ایک دن ظاہر ہو کے رہے گا۔ اہلِ ایمان صبر کے ساتھ اس عدل کے ظہور کا انتظار کریں، دعوتِ حق کے کام میں لگے رہیں اور نماز کا اہتمام رکھیں، نماز تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے والی اور اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی طاقت ہے۔

اہلِ کتاب کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اگر وہ مشرکین کے پہلو بہ پہلو ہو کر تم سے بحث و مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو جہاں تک ان کے اشرار کا تعلق ہے ان کو تو منہ نہ لگاؤ البتہ ان کے اندر جو معقول لوگ ہیں ان کو حُسن و خوبی کے ساتھ اس قدرِ مشترک کی اساس پر دعوت دو جو ان کے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ اسی ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور مخالفین کے بعض مطالبات کا جواب۔

ان مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب جو کفار کے ہاتھوں مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے اور ہجرت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مدد اور کفالت حاصل ہوتی ہے اس کی بشارت۔

آخر میں مشرکینِ قریش کو نہایت سخت الفاظ میں تہدید و وعید کہ قرآن کے خلاف ان کی تمام محاذ آرائی خود ان کے اپنے مسلمات کے خلاف ہے۔ یہ نہایت ناشکرے اور ناہنجار لوگ ہیں۔ ان کو جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ ہیں تو تمام تر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لیکن یہ ان کو منسوب دوسروں کی طرف کرتے اور ان کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ یہ لوگ عنقریب اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں گے اور جو لوگ آج اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی راہیں فراخ کرے گا۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱۔ ۶۹

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ
شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا
لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع اُتْلُ مَآ ع ۴ ۱۶
اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا
تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ
اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ
اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ
بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ
صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ
اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ
اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ع ۵ ۱

شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ
وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ
جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ يٰعِبَادِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ
نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ
عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ
اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۶ ۱۲
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا (وقف لازم)
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ
يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ
يَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا
جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾ ع ۳

ترجمہ آیات ۴۱ - ۶۹

ان لوگوں کی تمثیل جنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے! بے شک اللہ اچھی طرح جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ ۴۱-۴۳

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔ جو کتاب تم پر وحی کی جارہی ہے اس کو پڑھو اور نماز کا اہتمام کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۴-۴۵

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے

ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پہ جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔ ۴۶

اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف بھی کتاب اتاری تو جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اور ہماری آیات کا تو بس وہی انکار کرتے ہیں جو کٹر کافر ہیں۔ اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔ بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۷-۴۹

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں! کہہ دو، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری وہ ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ بے شک اس کے اندر رحمت اور یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا جنھوں نے انکار کیا وہی لوگ اصلی نامراد ہیں۔ ۵۰-۵۲

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ اور وہ ان کے اوپر اچانک آ جائے گا اور ان کو

اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اور وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس دن کو یاد کریں جس دن عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانک لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو اس چیز کا مزا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵۲-۵۵

اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں متمکن کریں گے، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انھوں نے بھروسہ رکھا اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵۶-۶۰

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۱-۶۳

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس لہو و لعب ہے۔ اور دار آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ

ہے اگر وہ اس کو جانتے! ۶۴

پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ پس جب ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت بخشی اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہولیں۔ پس وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۶۵-۶۶

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اُچک لیے جاتے ہیں! تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں! اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے پاس آچکا ہے! کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہوگا! ۶۷-۶۸

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے! ۶۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۴۱)

شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل

اوپر کے بیان کردہ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ مشرکین نے خدا کے سوا جو سہارے ڈھونڈھے تھے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ اور یہ جس طرح اس دنیا میں جھوٹے ثابت ہوئے اسی طرح آخرت میں بھی جھوٹے ثابت ہوں گے۔ خدا کا قانون مجازات اور اس کا بے لاگ عدل لازماً ظہور میں آکے رہے گا اور جو لوگ اپنے فرضی دیوتاؤں کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ جس سہارے کو انھوں نے قلعہ کی دیوار سمجھا اس کی حقیقت

مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی حقیقت کو یہاں تمثیل کی صورت میں سمجھایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے والوں کی مثال مکڑی کی ہے جو اپنے بنے ہوئے جالے کو اپنے زعم میں بڑی چیز سمجھتی ہے لیکن سب سے زیادہ بے ثبات اور بودا گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے جو ظاہر کردی گئی ہے لیکن اس کا فائدہ تو جب ہے کہ یہ لوگ سمجھیں لیکن ان نادانوں میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کہاں!

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۲)

یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کی یہ تمثیل ان کی مبالغہ آمیز تحقیر ہے۔ یہ تحقیر نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دیویوں دیوتاؤں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ "اچھی طرح واقف ہے" کے اسلوب بیان میں جو طنز و تحقیر مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔

شرک کی نفی خدا کی صفات سے

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ یعنی یہ دیوی دیوتا اس خدا کے مقابل میں اپنے پجاریوں کے کیا کام آسکیں گے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ 'حکیم' یعنی جس کا ہر کام عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا عزیز ہے تو کوئی دوسرا، خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی اونچا ہو اس کو اپنے زور و اثر سے دبا نہیں سکتا اور جب وہ حکیم بھی ہے تو کوئی اس کے قانون مجازات و عدل کو باطل نہیں کر سکتا۔ تو جب یہ دیوی دیوتا نہ اس کو دبا سکتے اور نہ اس کے عدل پر سر مُو اثر انداز ہو سکتے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ نادان لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خدا کے ہاں بڑا زور و اثر رکھنے والے ہیں اس وجہ سے یہ اپنی پرستش کرنے والوں کو، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کی نفی کرتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفتوں کی یاد دہانی کر کے اس بے ہودہ عقیدہ کی نفی کردی۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (۴۳)

قرآن کی اصطلاح میں اصل عالم کون ہیں؟

'امثال' سے اشارہ ان تمام امثال و واقعات کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مثالیں ہم جو بیان کر رہے ہیں اس سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے۔ ہم یہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ لوگ ان پر غور کریں اور خود اپنی زندگیوں کے لیے ان سے سبق حاصل کریں۔ کوئی مثال جب کسی کے سامنے رکھی جاتی ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس کو خود اس کا ماضی و مستقبل دکھا دیا جائے۔ لیکن دوسروں کی مثال سے خود اپنے لیے سبق حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر عقل و علم کی روشنی موجود ہو۔ یہاں 'عالمون' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی فطری صلاحیتیں

زندہ اور جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہر واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہیں جس سے درجہ بدرجہ ان کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن کے اندر سبق آموزی و عبرت پذیری کی صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے وہ اول تو اس طرح کی چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں کرتے اس لیے کہ اس سے ان کی بےفکری میں خلل پڑتا ہے اور اگر کچھ توجہ کرتے بھی ہیں تو اس میں اپنے لیے کوئی درس تلاش نہیں کرتے بلکہ اس کو محض قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں اصلی عالم وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہیں بلکہ عالم وہ ہیں جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرنے والے اور ان سے صحیح سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۴)

آسمان و زمین کی شہادت

یعنی آسمانوں اور زمین کے نظام پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دنیا نہ تو کسی خالق کے بغیر وجود میں آگئی ہے اور نہ یہ مختلف دیوتاؤں کی کوئی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ ایک علیم و حکیم اور عزیز و مقتدر خالق نے ایک مقصدِ حق کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہ مقصدِ حق سب کے سامنے آجائے گا۔ اس دن اس کے خالق کا کامل عدل ظاہر ہوگا اور باطل بالکل نابود ہو جائے گا۔ جو لوگ اس دنیا کو ایک بازی گاہ سمجھ کر زندگی بطالت میں گزار رہے ہیں وہ اپنی اس بے فکری کے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ آنکھیں کھول کر زندگی بسر کریں گے وہ خالق کی ابدی خوشنودی کے حق دار ٹھہریں گے۔ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا الاٰیۃ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اٰیَۃً کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے یعنی اس میں اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ اس نشانی کے مختلف پہلو مختلف مقامات میں واضح کیے جا چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک روزِ جزا و سزا کے ظہور کی ہے۔ یہ دنیا اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کا خالق حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اس کا کامل عدل و حق ظاہر ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے اور یہ بات اس عظیم خالق کی شان کے بالکل منافی ہے جس کی قدرت، حکمت اور رحمت اس دنیا کے ہر گوشے سے نمایاں ہے۔

دوسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں انجام کے اعتبار سے کامیاب زندگی وہی ہے

جو آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے اس لیے کہ ابدی کامیابی اور ابدی ناکامی کا فیصلہ وہیں ہونا ہے۔ یہ دنیا آخرت کے بغیر ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب کہ اس کی پیدائش کا اصلی مقصد ظہور میں آئے گا۔ یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر چیز کے خیر و شر کا فیصلہ اس کے اخروی نتائج کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ہوا ہے کہ حق کی راہ میں اہلِ حق کو نہایت زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن ان مصائب سے گھبرا کر حق سے انحراف جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ مصائب اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت خوش آئند ہیں۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ شرک و شفاعت کا نظریہ بالکل باطل ہے اس لیے کہ یہ نظریہ اس کائنات کے 'بالحق' ہونے کی بالکل نفی کر دیتا ہے۔ اگر اس کائنات میں ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود مان لیا جائے جو اپنے زور یا اثر سے کسی حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ کائنات 'بالحق' نہیں ہے بلکہ ایک اندھیر نگری ہے۔

اس ٹکڑے کی مزید وضاحت آگے سورۂ روم کی آیت ۸ کے تحت آئے گی۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۴۵)

پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم یہ قرآن لوگوں کو سناؤ اور اسی کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دو۔ اگر مخالفین ان نشانیوں اور دلائل کی طرف توجہ نہیں کرتے جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے بلکہ معجزے یا عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان کے ان مطالبات کی کوئی پروا نہ کرو۔ قرآن ان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اگر وہ اس کی قدر نہیں کریں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

'وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ' یعنی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ اس خاص مرحلے میں نماز کے اہتمام کی یہ تاکید، قرینہ دلیل ہے کہ عام نماز کے ساتھ اس خاص نماز کے لیے ہے جس کی ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو فرمائی گئی تھی اور جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکا ہے۔

دعوت اور جماعتی تربیت کے لیے دو باتوں کی ہدایت

یہاں دو باتوں کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ایک تلاوتِ وحی کی، دوسری اہتمامِ نماز کی۔ پہلی چیز کا تعلق عام تبلیغ و دعوت سے ہے اور دوسری چیز کا تعلق مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تربیت و اصلاح سے۔ آیت کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے ان کے نت نئے مطالبات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو وحی تم پر کی جا رہی ہے وہ لوگوں کو پہنچا دو، وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ تمہارے اوپر اصل ذمہ داری اسی وحی کو

پہنچا دینے کی ہے۔ اس سے آگے تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو تمہاری دعوت قبول کر چکے ہیں تو ان کی تربیت کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ یہی چیز ان کو ان مفاسد سے پاک کرے گی جو پچھلی قوموں کی تباہی کا باعث ہوئے اور اسی سے ان کے اندر وہ قوت و ہمت پیدا ہوگی جو مشکلات و مصائب کے علی الرغم ان کو ایک صالح معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل بنائے گی۔

نماز کے دو اہم پہلو

یہاں اس نماز کے دو اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ) اور دوسرا یہ کہ نماز اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) نماز کے یہ دونوں پہلو کسی قدر وضاحت کے محتاج ہیں۔

'فحشاء' اور 'منکر' کے دو لفظوں نے اخلاقی مفاسد کے تمام پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو شہوانی جذبات کی بے اعتدالی یا ان کے انحراف سے وجود میں آتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ پورے معاشرے کو اس طرح بے حیا بنا دیتی ہیں کہ لوگوں کے اندر سے بے حیائی کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔ ماضی کی قوموں میں سے اس کی مثال کے طور پر قرآن نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی بے حیائی کے لیے 'فاحشۃ' کا لفظ استعمال بھی فرمایا ہے۔ اس زمانے میں جدید فکر و فلسفہ اور نئی تہذیب کی برکت سے بے حیائی و فحاشی کی جو نت نئی شکلیں وجود میں آئی ہیں اور برابر آرہی ہیں ان کے مقابل میں قوم لوط کی بے حیائی بالکل گرد ہو کے رہ گئی ہے اور جن لوگوں کی نظر حالات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اب ہمارا معاشرہ بھی پوری طرح ان کے لپیٹ میں آچکا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں کا ضمیر اس طرح مردہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری قوم کا بہت بڑا طبقہ، جو ہماری بدقسمتی سے تعلیم یافتہ بھی کہلاتا ہے، ان بے حیائیوں کو بے حیائی سمجھنا تو درکنار ان کو تہذیب و ترقی کا لازمہ سمجھنے لگا ہے اور جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں ان کو احمق اور دقیانوسی قرار دیتا ہے۔

دوسری برائیاں وہ ہیں جو طمع و حرص کی بے اعتدالی اور حبِ مال و جاہ کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان کے لیے یہاں جامع لفظ 'منکر' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ معروف کا ضد ہے اس وجہ سے وہ تمام برائیاں اس میں شامل ہیں جو ایک صالح معاشرہ کی پاکیزہ روایات اور اس کے معروف مسلّمات کے خلاف ہوں۔ پچھلی قوموں میں سے قوم عاد و ثمود کے تمدنی مفاسد اور قوم شعیب کے معاشی فساد کا ذکر قرآن نے اس کی مثال کے طور پر کیا ہے اور اس زمانے میں معاشرت و معیشت کا یہ فساد زندگی کے ہر شعبہ پر جس طرح چھا چکا ہے اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ ماضی کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

یہاں معروف و منکر سے متعلق ان اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے سورۂ روم کی آیات ۳۱ - ۴۰ اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۷ کے تحت اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ آئے گی۔

فرمایا کہ نماز ان تمام برائیوں سے روکتی ہے۔ 'روکتی ہے'، یعنی نماز کی حیثیت ایک نہایت مؤثر واعظ و زاجر کی ہے۔ جو لوگ نماز اس کے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، ان کی نماز اپنے ظاہر و باطن دونوں سے، ان کو ان حقائق کی یاد دہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاد دہانی زندگی کو صحیح شاہراہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کی مثال اس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلا تو رہا ہے لیکن اس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں ان سے وہ بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اثرات اس نماز کے بیان ہو رہے ہیں جو صحیح تذکر اور اخلاص کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی نماز کے اندر یہ اثرات مفقود ہوں تو لازماً وہ یا تو صحیح 'تذکر' سے خالی ہے یا اخلاص سے۔ یعنی یا تو نماز پڑھنے والا اپنی نماز کے معنی مفہوم سے بالکل بے خبر ہے، اس کو کچھ معلوم نہیں کہ نماز میں اس نے کس چیز کا اقرار اور کس بات کا انکار کیا ہے یا یہ کہ اس نے محض دوسروں کو دکھانے کے لیے ریاکاری (ایکٹنگ) کی ہے۔

'وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ'۔ یہ نماز کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے اور دو لفظوں کے اندر معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جماعت کے اندر عزم و حوصلہ اور قوت و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کے اہتمام کی جو تاکید کی جا رہی ہے اس کو کوئی معمولی بات یا محض طفل تسلی نہ تصور کرے۔ اس سوئے ظن میں نہ مبتلا ہو کہ بھلا نماز جماعت کی تنظیم و تقویت میں کیا مؤثر ہو سکتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان کے دل کو حقیقی طمانیت و سکینت حاصل ہوتی ہے۔ 'أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ' (اچھی طرح سن لو کہ دلوں کو طمانیت اللہ کی یاد سے حاصل ہوتی ہے) اور دل ہی انسان کے اندر وہ چیز ہے جو تمام عزم و حوصلہ کا منبع ہے۔ اگر دل مضبوط ہے تو انسان سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں اور اگر دل کمزور ہے تو انسان سے زیادہ ناتواں کوئی شے نہیں اور دل کو قوت دینے والی اصلی چیز خدا کی یاد ہے جس کی سب سے زیادہ بہتر جامع اور مؤثر شکل نماز ہے۔

شجاعت اور تہور میں فرق

یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث دل کی وہ طمانیت و سکینت ہے جو انسان کے اندر وہ عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہے کہ جو اس کو خدا کے سوا ہر خوف اور ہر طمع سے بے پروا کر دیتی ہے۔ یہی وہ اصلی قوت اور حقیقی شجاعت و بسالت ہے جو ایمان اور خدا کی یاد سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ شجاعت اس تہور سے بالکل مختلف چیز ہے جو مایوسی یا جذبۂ انتقام، یا خوف یا ناموری کی خواہش یا ناعاقبت اندیشی

سے ظہور میں آتا ہے۔ جو لوگ شجاعت اور تہوّر کے اس فرق سے واقف نہیں ہیں وہ ایک مومن کی شجاعت اور ایک کافر کے تہور کو ایک ہی نوعیت کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے نفسیاتی محرکات بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں دونوں کے اثرات بھی دو بالکل مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک کا منبع ایمان اور اللہ کی یاد ہے اور دوسرے کا منبع ان نفسیاتی محرکات میں سے کوئی محرک ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس وجہ سے ایک کی شجاعت سے دنیا میں اس طرح کی برکت و رحمت ظہور میں آتی ہے جس طرح کی رحمت و برکت حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کی شجاعت سے ظہور میں آئی اور دوسرے کے تہور سے اس قسم کا شر و فساد ظہور میں آتا ہے جس قسم کا شر و فساد ہٹلر اور مسولینی اور اس قبیل کے دوسرے متہورین کے ہاتھوں ظہور میں آیا۔

مسلمانوں کو تسلی

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: یہ مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اپنی تربیت اور دوسروں کی اصلاح کے لیے جو جد و جہد بھی تم کر رہے ہو یا کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے تو جب وہ واقف ہے تو اس پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ تمہاری کوئی محنت خواہ وہ شب کی خلوتوں میں ہو یا دن کی جلوتوں میں، ضائع نہیں جانے دے گا بلکہ تم اپنی ہر کوشش کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں خطاب بصیغۂ واحد ہے اور اس ٹکڑے میں جمع کا صیغہ آگیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اوپر کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ علاوہ خطاب بھی تمام امت سے ہے اس لیے کہ دعوت اور تربیت کی ذمہ داری جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اسی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی تھی لیکن واحد کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ پیغمبر کو تو یہ فرض بہر حال ادا کرنا ہے، خواہ دوسرے اس کو ادا کریں یا نہ کریں۔ وہ ادا کریں گے تو اپنی ایک ایک محنت کا اجر پائیں گے اور اگر نہیں کریں گے تو خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی محرومی کا سامان کریں گے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶)

پڑھے لکھے حریفوں سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت

دعوت کے اس دور میں، جو اس سورہ میں زیر بحث ہے، اہل کتاب بھی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے جس طرح اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے باب میں دعوت کا طریقہ واضح کر دیا گیا جو قرآن کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے معجزات کے طالب تھے اسی طرح یہاں چند آیات میں اس طریقہ کی وضاحت فرما دی گئی جو اہل کتاب کے ساتھ بحث و استدلال میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اہل کتاب کی اس خصوصیت کی وجہ آگے کی آیات سے خود واضح ہو جائے گی کہ ان کی دینی حیثیت بھی مشرکین عرب سے بالکل مختلف تھی اور ان کے شبہات و اعتراضات بھی ذرا مختلف نوعیت کے تھے۔ یہ پڑھے لکھے

جنات تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ضروری ہدایات پہلے سے دے دی جائیں۔

فرمایا کہ اہل کتاب سے بحث و استدلال کی نوبت آئے تو ان سے صرف احسن طریقہ سے بحث و استدلال کرو۔ مجادلۃ یہاں اچھے معنوں یعنی بحث و استدلال اور حجت کے مفہوم میں ہے۔ اور طریقۂ احسن کی وضاحت اسی آیت کے آگے والے ٹکڑے میں آگئی ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان دین کے جو مشترک اقدار ہیں ان کو بنیاد قرار دے کر ان سے مطالبہ کرو کہ وہ بھی ان مشترک اقدار اور ان کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی خود اپنے منہ سے تردید نہ کریں۔ اس طریقۂ بحث سے ان کی انانیت کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ ان میں جو سلیم الطبع ہوں گے وہ تمھاری باتوں پر غور کریں گے اور کیا عجب کہ ان میں سے کچھ ایسے نفوس بھی نکل آئیں جو حق کو قبول کرلیں۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو شریر اور مناظرہ باز ہیں ان کے ساتھ طریق احسن کی پابندی ضروری نہیں ہے، ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے لیکن میرے نزدیک یہ استثنائے منقطع ہے۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رہے وہ جو ان میں سے شریر اور مناظرہ باز ہیں تو ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ۔ قرآن کے نظائر سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضدی اور کج فہم مناظرہ بازوں اور کٹ حجتی کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ کہف میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جو بحث و مرمات سمجھنی نہیں چاہتے ان سے اول تو تعرض ہی نہ کرو اور اگر کبھی بحث کی نوبت آہی جائے تو بات ٹالنے (مراء ظاہر) کے انداز میں گفتگو کرو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا طریقۂ بحث و دعوت ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہی طریقہ خیر و برکت کا طریقہ ہے۔ شریروں اور کج فہموں کے جواب میں انھیں کی سی روش اختیار کرلینا اور الزام کا جواب الزام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور نہ اس میں کوئی خیر و برکت ہے۔

احسن طریقۂ بحث کی وضاحت

وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُکُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ۔ یہ اس احسن طریقۂ بحث و دعوت کی وضاحت ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان قدر مشترک موجود ہے اس وجہ سے اس قدر مشترک کو بنیاد بنا کر ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دو۔ ان سے کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتری ہے۔ ہم جس کتاب پر ایمان لائے ہیں وہ تمھاری کتابوں کی مکذب نہیں بلکہ ان کی مصدق ہے۔ تمھاری کتابوں میں آخری نبی اور کتاب کامل سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں وہ اپنے مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں اس کتاب سے وہ مصداق ظہور میں آگیا تو ہم تمام اگلے انبیاء اور صحیفوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اگر تم بھی صحیح روش

اختیار کرو تو تمھیں اس رسول اور اس کتاب سے چڑنے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کے ظہور سے سب سے زیادہ تمھارا سر اونچا ہوا ہے اس لیے کہ ان کی بشارت اپنے صحیفوں کے واسطے سے تمھی نے دنیا کو سنائی تھی۔ اب اگر ضد میں آ کر تم نے انکار کیا تو تم خود اپنے کو اور اپنے صحیفوں کو جھٹلاؤ گے درآنحالیکہ ہم تمھارے صحیفوں کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں۔

اسی طرح ان کو کامل توحید کی بھی دعوت دو اور ان سے کہو کہ ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی اصولی نزاع نہیں ہے۔ تورات و انجیل اور دوسرے تمام صحائف توحید کی تعلیم سے معمور ہیں۔ بس ہم میں اور تم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ جو باتیں اس مسلّم حقیقت کے خلاف ہیں ہم نے ان کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم توحید کے بھی مدعی ہو اور ساتھ ہی تم نے اپنے اندر ایسی باتیں بھی جمع کر رکھی ہیں جو اس عقیدے سے صریحاً متناقض ہیں تو ہماری دعوت تمھارے لیے یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے آپ کو کلیتہً اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے اسی طرح تم بھی اپنا یہ تناقض دور کر کے مسلم بن جاؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۴۷)

قرآن کا دعویٰ

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ۔ یعنی دعوت کے اسی اصول پر جس کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مدعی نہیں ہے کہ سب سے پہلے یہ باتیں اسی کتاب میں نازل ہوئیں بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دین کی دعوت دی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے لیکن پچھلی امتوں نے یا تو اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات بھلا دیں یا ان میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق تبدیلیاں کر دیں اس طرح اللہ کا دین بالکل مسخ و محرف ہو گیا تھا۔ اب اللہ نے اپنے دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں اس کتاب اور اس رسول کے ذریعہ سے پھر دنیا میں اتارا ہے تاکہ خلق اللہ کی ہدایت سے محروم نہ رہے۔

صالحین اہل کتاب کے ایمان کی بشارت

فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ ہم پیچھے جگہ جگہ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں اہل کتاب کا ذکر معروف کے صیغے سے کیا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، بالعموم اچھے معنوں میں کیا ہے اس وجہ سے اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے یہاں مراد عام اہل کتاب نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر کے وہ لوگ ہیں جو اپنے علم کے حد تک تورات و انجیل پر قائم تھے۔ ان لوگوں کے بابت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ اگر ان کے آگے تم اس کتاب کو اس طرح پیش کرو گے جس طرح تمھیں ہدایت کی جا رہی ہے تو یہ صالحین اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔

وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ۔ یہاں 'يُؤْمِنُ بِهٖ' حال کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اسی گروہ

کے کچھ لوگ ہیں جن کو تم دیکھ رہے ہو کہ وہ ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی جن کے اندر صلاحیت باقی ہے آہستہ آہستہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ'۔ یعنی ہماری آیات (قرآن) کا انکار تو ان اہل کتاب میں سے صرف وہی کریں گے جو کٹے کافر ہیں یعنی جن کا ایمان نہ اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں اور رسولوں پر ہے اور نہ وہ آئندہ کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۸)

آنحضرت صلعم کی رسالت کی ایک دلیل

یہ اہل کتاب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر وہ ضد اور انانیت سے کام نہ لیں تو تمھاری رسالت کی یہ دلیل ان کے لیے کافی ہے کہ ایک شخص جس نے نہ آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ پڑھا اور نہ جو لکھنے کے فن سے واقف ہے آخر اس کے اوپر یہ تمام علوم کہاں سے برس پڑے کہ اس نے نہ صرف تمام نبیوں کی تعلیم کو از سر نو زندہ کر دیا بلکہ جو کسر انھوں نے چھوڑی تھی وہ بھی اس نے پوری کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی یہ دلیل یوں تو سب پر حجت ہے لیکن اہل کتاب پر یہ خاص طور پر حجت ہے اس لیے کہ وہ انبیاء سابقین کی تمام شریعت و حکمت کے وارث تھے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ و حضرت مسیحؑ تک کے سارے خزائن حکمت ایک اُمّی پر کس طرح نازل ہو گئے۔

'اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ'۔ یعنی اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تب تو یہ جھٹلانے والے لوگ کوئی نہ کوئی لایعنی بات شک پیدا کرنے والی بنا سکتے تھے۔ بصورتِ موجودہ ان کے لیے کوئی بات بنانے کا موقع تو ہے نہیں لیکن اب بھی اگر وہ شکوک پیدا کرتے ہیں تو ان کی شامت ہی ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۴۹)

سچے اہل کتاب کے لیے قرآن ان کے دل کی آواز ہے

یعنی اہل کتاب میں سے جن کے اندر دین کا صحیح علم ہے ان کے سینوں میں تو یہ قرآن نہایت واضح اور روشن آیات کی شکل میں موجود ہے۔ وہ اس کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی بات سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک جانی پہچانی ہوئی اور ایک موعود و منتظر چیز ہے۔ وہ اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے لیے سراپا انتظار تھے۔ اور اب اس کو پا کر سمجھتے ہیں کہ گویا ان کو اپنی مطلوب و محبوب چیز مل گئی۔ قرآن مجید میں سچے اہل کتاب کے جذبات، قرآن اور آخری رسول سے متعلق نہایت واضح الفاظ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آخری بعثت کے لیے چشم براہ تھے اور کس والہانہ جذبہ کے ساتھ انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس آیت میں بھی اجمال کے ساتھ اسی حقیقت کی

طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ' میں وہی حقیقت دوسرے الفاظ میں واضح فرمائی گئی ہے جو اوپر آیت ۴۷ میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی قرآن کی ان آیات کا انکار تو وہی کرتے ہیں جنھوں نے اللہ کے عطا کردہ علم کی ناقدری کر کے اپنے سینوں اور دلوں کو تاریک کر لیا ہے اور اس طرح خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ یہاں 'ظٰلِمُوْنَ' سے وہی بدبخت لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۴۶ میں 'اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جن کے باب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ ان سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ وہ بالکل ناقابلِ علاج ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰)

اہلِ کتاب کے سکھائے ہوئے ایک اعتراض کا جواب

یہ اہلِ کتاب کا ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے لیکن جواب کا انداز نہایت بے پروائی کا ہے، یہاں تک کہ ان کو مخاطب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کے واسطہ سے ان کو بات پہنچا دی ہے۔ اہلِ کتاب کا عام اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اول اول یہی رہا ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں عطا ہوئے جس طرح کے معجزے ہمارے نبیوں، خاص طور پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو عطا ہوئے۔ یہ اعتراض وہ قریش کو اکسانے کے لیے اٹھاتے تھے۔ قریش کے لیڈر ان سے سوال کرتے کہ آپ لوگ نبوت و رسالت کے لوازم و خصوصیات سے خوب واقف ہیں تو ان نئے مدعیِ نبوت کے بارے میں آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ اس کے جواب میں وہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ کہہ دیتے کہ ہم اور کچھ تو کہہ نہیں سکتے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو آخر ان پر بھی اس طرح کے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے جس طرح کے معجزے سابق نبیوں پر اتارے گئے! اہلِ کتاب کے اس اعتراض سے چونکہ قریش کو ایک بہت بڑی تائید حاصل ہو جاتی اس وجہ سے وہ اس کو خوب پھیلاتے اور عوام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرتے۔ قرآن نے یہاں اہلِ کتاب کے القا کردہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور جواب میں اہلِ کتاب سے زیادہ قریش کو سامنے رکھا ہے اس لیے کہ اس قسم کے اعتراضات سے سب سے زیادہ نقصان انھی کو پہنچتا کہ وہ اپنے حاسدوں کے حسد کے شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم ہو جاتے۔

'قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ'۔ یہ اس اعتراض کا پہلا جواب ہے کہ نشانیوں اور معجزات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہے گا تو کوئی نشانی دکھا دے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں دکھائے گا۔ میں تو صرف ایک نذیرِ مبین ہوں، مجھے حکم ہے کہ تمھیں آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دوں سو یہ فرض میں ادا کر رہا ہوں۔ باقی تمام

امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمہاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دوں۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۵۱)

یہ دوسرا جواب ہے اور نہایت جامع ہے۔ فرمایا کہ کیا ان کے لیے تمہاری نبوت و رسالت کی یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر ایک کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک پوری کتاب ان کو سنائی جا رہی ہے جو اپنے دعوے پر خود حجت ہے اور اس کا سنانے والا بھی سامنے موجود ہے تو اس عظیم نشانی کے ہوتے کسی اور نشانی کی ضرورت کہاں باقی رہی۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ کسی حسّی معجزے یا کسی نشانیٔ عذاب کے بجائے اس نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اگر وہ کوئی حسّی معجزہ دکھاتا تو وہ بہر حال ایک وقتی چیز ہوتا اور اگر کوئی نشانیٔ عذاب دکھاتا تو وہ ایک آفت ہوتی، اور معلوم نہیں وہ کس شکل میں نمودار ہوتی۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ اس نے ان پر کتاب اتاری جو ان کے واسطے ایک دائمی رحمت اور یاددہانی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ لفظ 'ذِكْرٰى' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ قرآن درحقیقت انسان کو انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود اس کی عقل و فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔ قرآن کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی نشانی یا معجزے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان قرآن کی رہنمائی میں اپنی فطرت کے خزانوں کا جائزہ لے۔ وہ خود دیکھ لے گا کہ قرآن جو کچھ بتا رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۲)

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ شبہات و اعتراضات جو اٹھائے جا رہے ہیں یہ تو محض اوپری باتیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل گواہی دے رہے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور جو کچھ تم ان کو بتا رہے ہو حرف حرف ٹھیک ہے تو ایسے لوگوں سے زیادہ بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے کہ فی الحقیقت تم پر میری صداقت واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے تم نے انکار کیا یا سب کچھ جان بوجھ کر محض اپنی مشیخت کی پاسداری میں تم نے میری تکذیب کی۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے ہر بھید سے اچھی طرح واقف ہے، وہ قیامت کے دن سارا راز کھول دے گا۔ البتہ یہ یاد رکھو کہ جو لوگ جان بوجھ کر باطل پر ایمان لائیں گے اور خدا کا انکار کریں گے وہی لوگ آخرت میں اصلی نامراد ہونے والے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۵۳)

اوپر جن نشانیوں کے مطالبے کا ذکر ہے ان میں خاص طور پر عذاب کی نشانی کے لیے قریش بہت مستعجل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن کی تکذیب کی صورت میں ان کو عذاب سے ڈراتے تو اس سے ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی اور وہ جھنجھلا کر آپ کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مدت مقرر ہے، اس مدت سے پہلے عذاب نہیں آتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مقررہ سنت نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں اگر ان لوگوں کی اس جلد بازی کے باوجود دیر ہو رہی ہے تو اس دیر کا سبب نہ کسی کا پاس و لحاظ ہے، نہ کسی کی قوت و صولت اور نہ کسی تیاری کی ضرورت، بلکہ خود خدا کا اپنا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ اس قانون کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تباہی کی مدت ان کے اخلاقی زوال کے پیمانے سے ناپ کر مقرر کی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوا، کوئی دوسرا اس چیز کو نہیں جانتا۔ فرمایا کہ جب عذاب کا وقت آ جائے گا تو وہ اچانک ان پر آ دھمکے گا، وہ اس کے مقابل میں کوئی پیش بندی نہ کر سکیں گے۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴-۵۵)

جس عذاب کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ ہے

یہاں ان کے استعجال بالعذاب کو پھر دہرایا ہے۔ بظاہر اس تکرار کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ اعادہ اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے طنطنہ سے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا عذاب ان سے بہت دور ہے، حالانکہ عذاب ان کے اوپر اور ان کے نیچے سے ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ خدا کی جہنم کے احاطے میں ہیں۔ یہ جن اعمال کے اندر گھرے ہوئے ہیں یہی اعمال ان کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے، تو جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے ہیں اس کا پورا سامان تو انھوں نے خود فراہم کر رکھا ہے۔ ان کے یہی اعمال ایک دن عذاب بن کر ان کے اوپر اور نیچے سے ان کو ڈھانک لیں گے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو جس کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ——— مطلب یہ ہوا کہ جس عذاب کا لبادہ انھوں نے خود اوڑھ رکھا ہے اس کے لیے جلدی مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی باہر سے منگانے کی چیز تو نہیں ہے، اس کو تو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ یہ محض خرد باختگی ہے کہ وہ اس کو دور سمجھ کر اس کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (۵۶)

مظلوم مسلمانوں سے خطاب

یہ ان مظلوم مسلمانوں کو خطاب فرمایا جن کا مسئلہ ابتدائے سورہ سے اس میں زیرِ بحث ہے۔ — انداز خطاب میں بڑی دلنوازی ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو، اگر تم پر مکّہ کی سرزمین تنگ کردی گئی ہے تو تم مایوس اور دل شکستہ ہو کر میری بندگی کے عہد سے دست بردار نہ ہونا بلکہ اپنے اس عہد پر جمے رہو۔ اگر یہ سرزمین تمھیں چھوڑنی پڑی تو اطمینان رکھو کہ میری زمین بہت کشادہ ہے، کوئی اور سرزمین تمھارا خیر مقدم کرے گی۔ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ بہر حال تم جمے رہو کہ میرے سوا کسی اور کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرو گے۔ اگر میری خاطر تم اپنے گھروں کو چھوڑو گے تو تمھاری ذمہ داری میرے اوپر ہے اور میرے پاس کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق ہدایات

اس آیت سے چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آگئیں۔

—— ایک یہ کہ کسی سرزمین سے ہجرت صرف اس وقت ضروری ہوتی ہے جب اس میں آدمی کے دین و ایمان کے لیے فتنہ پیش آجائے۔

—— اگر فتنہ پیش آجائے تو وہ ہر قیمت پر اللہ کی بندگی کے عہد پر قائم رہے، کسی صورت میں بھی غیر اللہ کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرے۔

—— اگر اپنے ایمان کو بچانے کے لیے اپنا گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑ جائے تو سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ رزّاق و کفیل ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۵۷)

تسلی کا ایک اہم پہلو

یہ آیت اگرچہ تہدید و تسلی دونوں کی متحمل ہے لیکن یہاں پیش و عقب کی آیات تسلی کے مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی تو چند روزہ ہے۔ بالآخر ایک دن سب کو مرنا اور خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر آدمی اپنے رب سے کیوں تہ رساہ ہو! اپنے رب کی خاطر اس دنیا ہی پر کیوں نہ لات مارے!

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۵۸)

یعنی خدا کے ہاں کسی کی کوئی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ جو لوگ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بالاخانوں میں فروکش کرے گا اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حیاتِ چند روزہ کے ایمان و عملِ صالح کے بدلے جب یہ اجر دائمی و ابدی حاصل ہونے والا ہے تو یہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہر عاقل کو اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے، اس دنیا کے بڑے سے بڑے عیش کی خاطر بھی اس کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۵۹)

یہ 'عاملین' کی صفت ہے اور اس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ صلہ ہمارے ان کارگزار بندوں کے لیے ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہماری بندگی پر ثابت قدم اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے رہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اپنے رب پر یہ بھروسہ ہی ہے جو ہر طرح کے حالات میں بندے کو خدا کی بندگی پر استوار رکھتا ہے۔ اگر یہ بھروسہ نہ ہو تو ہجرت اور جہاد تو درکنار کوئی معمولی آزمائش بھی آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶۰)

خدا کا خوانِ کرم بہت کشادہ ہے

یعنی جس طرح خدا کی زمین بہت کشادہ ہے اسی طرح خدا کا خوانِ کرم بھی بہت کشادہ ہے۔ اگر اللہ کی راہ میں اموال و جائداد سے دست بردار ہونا پڑ جائے تو بے درنگ ہاتھ جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا، یہ نہ سوچنا کہ آگے کیا کھائیں گے اور کہاں سے پہنیں گے؟ دیکھتے ہو کہ اس زمین میں کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے تاہم ان کا رب ان کو ان کا رزق بہم پہنچاتا ہے۔ وہی رب ان کو بھی رزق دیتا ہے وہی تم کو بھی رزق دیتا ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کی فریاد سنتا اور ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم اس کو پکارو گے اور وہ بے خبر رہے گا یا تم حاجت مند ہو گے اور وہ تمھاری پریشانی سے ناواقف ہو گا۔

یہی حکمت سیدنا مسیحؑ نے اپنے انداز میں یوں واضح فرمائی ہے:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا! اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں[1] رہتی ہیں اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی

---

[1] غیر قوموں سے حضرت مسیح علیہ السلام کافر قوموں کو مراد لیتے ہیں۔ یہ قدیم صحیفوں کی ایک معروف اصطلاح ہے۔

کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔" متی باب ۶: ۲۵-۳۴

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے جو حکمت اتنے فقروں میں واضح فرمائی ہے وہ اس نے ایک ہی آیت میں سمیٹ دی ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۱)

خدا ہی پر بھروسہ کرنے کے دلائل

اوپر کی آیات میں خدا ہی پر بھروسہ کرنے اور اسی کی راہ میں جینے اور مرنے کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اسی کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور حقدار نہیں ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ حقیقت ایسی مسلّم ہے کہ اس سے ان لوگوں کو بھی مجالِ انکار نہیں ہے جو خدا کے بہت سے شریک و سہیم بنائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ اگر ان سے بھی پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق، سورج اور چاند کا مسخر کرنے والا کون ہے تو وہ بھی اس کا یہی جواب دیں گے کہ اللہ! اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر وہ معلوم نہیں کہاں بھٹک جاتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ماویٰ و مرجع مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو آسمان و زمین یا سورج اور چاند کا خالق نہیں مانتے تھے۔ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ جن ہستیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ خدا کی بڑی مقرب ہیں۔ وہ ان کے لیے جو چاہیں خدا سے منوا سکتی اور کرا سکتی ہیں۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ کے الفاظ سے ان کے اسی تضادِ فکر پر اظہارِ تعجب فرمایا ہے کہ جب ہر چیز کا خالق و مالک خدا ہے تو آخر دوسروں کو ماویٰ و مرجع بنانے، ان کی پوجا کرنے اور ان سے استغاثہ و استرحام کا کیا تُک ہے! یہ تو خود اپنے منہ سے خود اپنے مسلّمہ کی تردید ہے!

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۲)

رزق کی کمی بیشی اللہ ہی کے اختیار میں ہے

یعنی جب آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سورج اور چاند کو ہماری خدمت میں اسی نے سرگرم کیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رزق کے خزانوں کا مالک کوئی اور بن بیٹھے۔ پھر تو وہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق رزق کی تقسیم فرماتا ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہے کہ اس کو بتائے کہ فلاں کا رزق پہنچا ہے، فلاں کا نہیں پہنچا اور نہ کوئی اس کے بندوں کے احوال و مصالح سے اس سے زیادہ باخبر ہے کہ اس کو ٹوک دے سکے کہ فلاں کا رزق زیادہ ہونا چاہیے، فلاں کا کم۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۶۳)

مشرکین کا تضادِ فکر

اسی طرح اگر ان سے سوال کرو کہ وہ کون ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے زمین کو، اس کے خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے تو اس سوال کا جواب بھی وہ یہی دیں گے کہ اللہ! ان سے کہو، اگر اس بات کا تم کو اقرار ہے تو پھر تو شکر کا سزاوار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوا تو آخر تم اس کے سوا دوسروں کی عبادت کس حق کی بنا پر کرتے ہو!

مشرکینِ عرب ابر و ہوا پر بھی حقیقی تصرف اللہ تعالیٰ ہی کا مانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ رزق و فضل کو دوسروں کی طرف منسوب اور ان کی عبادت کرتے۔ اس طرح وہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا تھے حالانکہ جب یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں تو شکر کا حقدار بھی وہی ہوا اور یہی شکر تمام عبادت و اطاعت کا محرکِ اوّل ہے۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ یعنی یہ تضادِ فکر ہے تو نہایت بھونڈے قسم کا لیکن ان کی اکثریت اس پر غور نہیں کرتی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَإِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ؕ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۶۴)

گمراہی کا اصل سبب

یہ ان کی ساری گمراہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیائے فانی کی دلفریبیوں نے ان کو اس طرح گرویدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے مفادات سے بالاتر ہو کر کسی چیز کو سوچ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ یہ دنیا جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں اور جس کے عشق نے ان کی عقل اور ان کے دل کی ہر چیز کو ماؤف کر دیا ہے اس کی حقیقت چند روزہ لہو و لعب سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اصلی زندگی دارِ آخرت کی زندگی ہے لیکن اس کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ دنیا کی زندگی قدر و قیمت رکھنے والی چیز اس صورت میں بنتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اس صورت میں بے شک انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر یہ محض چند دن کا کھیل تماشا ہے اور اس کے بدلے میں انسان ابدی خسران کا وارث بنتا ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے متوالے لوگ اس حقیقت کو جانیں اور سمجھیں۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۙ لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۶۵-۶۶)

دنیا کے سرمستوں کی تمثیل

یعنی دنیا کے ان سرمستوں کی مثال کشتی کے مسافروں کی ہے۔ جب کشتی سازگار ہوا کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہے تو یہ اس میں اس طرح مگن ہوتے ہیں گویا ابر و ہوا سب انہی کے تابعِ فرمان ہیں لیکن جونہی کشتی کسی طوفانی

گرداب میں پھنسی ان کو خدا یاد آتا ہے اور اس وقت وہ اس سے مخلصانہ اطاعت کا عہد کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں لیکن جب کشتی گرداب میں سے نکل جاتی ہے تو وہ اپنی انہی سرمستیوں اور گمراہیوں میں پھر کھو جاتے ہیں جن میں پہلے کھوئے ہوئے تھے اور خدا سے کیا ہوا عہد ان کو بالکل بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح خدا کی بخشی ہوئی نجات ان کے لیے خدا ہی کی ناشکری کی راہ کھولتی ہے اور ہم بھی ان کو ڈھیل دے دیتے ہیں کہ وہ چند دن ہماری نعمتوں سے متمتع ہو لیں، بالآخر تو ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہے۔

اس آیت میں بعض اجزاء محذوف ہیں، ہم نے نظائر قرآن کی روشنی میں وہ کھول دیے ہیں۔ یہ مضمون مختلف اسالیب سے زیر بحث آچکا ہے اس وجہ سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ روم میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم: ۳۳-۳۴)

اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر پھر جب وہ ان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے ان کو بخشی۔ تو چند دن فائدہ اٹھا لو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا!

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۶۷)

اوپر کی تمثیل کا انطباق قریش کے حال پر

فرمایا کہ بالکل یہی حال قریش کے ان ناشکروں کا ہے۔ یہ اپنی تاریخ کی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں درآنحالیکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان کے لیے امان ہے نہ کسی کا مال محفوظ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر انھوں نے یہ کی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے حرم کے کونے کونے میں انھوں نے بتوں کو لا بٹھایا ہے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان بدبختوں سے پوچھو کہ کیا وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کشتی کی جو مثال دی ہے اس میں اور اس صورت واقعہ میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ یہ مامون حرم قریش کے لیے ایک سفینۂ نجات کے مانند تھا جس میں ہر خطرے سے بالکل بےخوف وہ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس چین کی زندگی نے ان کو خدا سے بالکل غافل کر دیا۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو ان کو بھی وہ اسی بےاطمینانی میں مبتلا کر سکتا تھا جس میں ان کے گرد و پیش کے لوگ مبتلا تھے لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی سازگار ہوا سے رواں دواں رہے اس وقت تک وہ چین کی بانسری

بچاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بازی اس کی ہے لیکن جب کسی گرفت میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے۔

اس حرم کی تولیت کی بدولت قریش کو جو زعامت اور سارے عرب پر جو قیادت و سیادت حاصل ہوئی اس پر مفصل بحث کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ قصص کی آیت ۵۷ کے تحت بھی اس پر بحث گزر چکی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْكٰفِرِیْنَ (۶۸)

فردِ قراردادِ جرم سنانے کے بعد ایک سوال

تمام فردِ قراردادِ جرم سنانے کے بعد سوال فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑ کر لگائیں یا حق کو جھٹلائیں جب کہ وہ ان کے پاس آ چکا ہے۔ 'افتراء علی اللہ' سے مراد دینِ شرک ہے اور 'حق' سے مراد یہاں قرآن اور رسول ہیں۔ 'لَمَّا جَآءَهٗ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو ان کے لیے اللہ کے ہاں کچھ عذر ہو سکتا تھا لیکن اب جب کہ رسول بھی آ چکا اور قرآن بھی نازل ہو چکا تو ان کے لیے کیا عذر باقی رہا! 'اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْكٰفِرِیْنَ' کیا ایسے کٹے کافروں کا ٹھکانا بھی دوزخ میں نہ ہوگا! مطلب یہ ہے کہ ایسوں کے دوزخی ہونے میں بھلا کسے کلام ہو سکتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (۶۹)

اہلِ ایمان کو بشارت

کفار کو ان کے ٹھکانے تک پہنچا کر ان مظلوم مسلمانوں کی طرف پھر توجہ فرمائی جن کا مسئلہ اس سورہ میں ابتدا سے زیرِ بحث ہے۔ فرمایا کہ ہمارے جو بندے ہماری راہ میں آج طرح طرح کی مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ وعدہ ان کے لیے دین، دنیا اور آخرت تینوں سے متعلق ہے۔ یعنی ان کے لیے دین کی راہیں بھی کھلیں گی، ان کی دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی صراطِ حمید کی طرف فرمائے گا۔

'وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ' یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی معیت کی بشارت ہے اور یہ بہت بڑی بشارت ہے اس لیے کہ جن کو اللہ کی معیت حاصل ہو تو شمس و قمر سب ان کی راہ میں گرد ہیں لیکن یہ بشارت 'احسان' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو نہایت خوبی کے ساتھ راہِ حق کی مصیبتوں کا مقابلہ کریں گے اور ہر مرحلے میں اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کر دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

بروز پیر۔ دس بجے دن
۲۷ مئی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد